احمد فراز

کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

نہ جانے کتنے دلوں کے وہ گھاؤ سہتے تھے
مزاج میں وہ ہمیشہ ہی نرم رہتے تھے
سخن وروں میں یہ چرچا رہا بہت دن تک
غزل وہی ہے جو احمد فرازؔ کہتے تھے

ڈاکٹر آفتاب عرشی

احمد فراز

کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر آفتاب عرشی

جی۔ این۔ کے۔ پبلی کیشنز

AHMAD FARAZ
Ki Shayeri ka Tanqidi Jayeza

BY : Dr. AFTAB ARSHI
Mob.9440936810, 9347334855
arshi9886@gmail.com / arshihcu@rediffmail.com

Year of Ist Edition 2022
ISBN 978-93-91606-00-8
Price Rs. 325

کتاب کا نام	:	احمد فراز کی شاعری کا تنقیدی جائزہ
مصنف کا نام	:	ڈاکٹر آفتاب احمد
قلمی نام	:	ڈاکٹر آفتاب عرشی
قیمت	:	۳۲۵/تین سو پچیس روپے
سن اشاعت	:	۲۰۲۲ء
صفحات	:	۲۰۰
تعداد	:	۱۰۰۰
کمپوزنگ	:	مولانا عبدالرافع خلیلی ندوی
مطبع	:	جی۔این۔کے۔پرنٹرس، نئی دہلی
رابطہ	:	Mob. 9440936810,arshi9886@gmail.com

Published by

GNK PUBLICATIONS

Head Office : Near Old Bus Stand
Charari Sharief, Budgam - 191112 (J&K)
Mobile : 7006738304, 9541123110
E-mail : gnkpublications@gmail.com
www.gnkpublications.com

انتساب

استاد محترم پروفیسر مظفر علی شہ میری

عقیدتِ فرازؔ

نہ جانے کتنے دلوں کے وہ گھاؤ سہتے تھے
مزاج میں وہ ہمیشہ ہی نرم رہتے تھے
سخن وروں میں یہ چرچا رہا بہت دن تک
غزل وہی ہے جو احمد فرازؔ کہتے تھے

ڈاکٹر آفتاب عرشیؔ

فہرست

حرفِ آغاز

مَیں تو کچھ بھی نہیں خدا میرے
ہے کرم تیرا یہ حقیقت ہے
کام جیسا بھی ہے کیا مَیں نے
یہ بھی تیری بڑی عنایت ہے

شاعری جادو تو نہیں مگر جادو جیسی کوئی شئے ضرور تسلیم کی جا سکتی ہے۔ جس میں بروقت کائنات سے لے کر انسانی زندگی کے نشیب و فراز کی کیفیتیں موجود ہوتی ہیں تو کہیں معاشرے کا درپن ہوتا ہے۔ بہر حال بچپن ہی سے شعر گوئی کے شوق نے مجھے شاعری کے مطالعے کی طرف راغب کیا۔ جس کی وجہ سے بہت سے شعراء کو پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی احمد فراز کی شاعری ہے۔

شہرت کے اعتبار سے اردو شاعری کے چند ہی ایسے نام ہیں جنہیں غیر اردو داں طبقے میں بھی اپنی پہچان ملی۔ انھیں ناموں میں ایک نام احمد فراز کا بھی شامل ہے۔ دنیا کے جس خطے میں بھی اردو زبان بولنے والے موجود ہیں اور شاعری ان کا شغف ہے۔ وہاں فرازؔ کی شاعری کے دیوانے ضرور مل جائیگے۔

آج کے عہد میں کسی شاعر کی شہرت کے چار ذرائع ہیں۔

(۱) مشاعرہ۔۔۔۔دنیا بھر کے بڑے مشاعروں کے اسٹیج پر فراز نظر آتے رہے۔

(۲) رسالے۔۔۔۔اردو ہی نہیں بلکہ ہندی رسالوں میں بھی احمد فرازؔ کے کلام شائع ہوتے رہے

(۳) گلوکار۔۔۔۔آج کی غزل گائیکی کا تصور احمد فرازؔ کی غزل کے بغیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فرازؔ کی غزلیں گلوکار مہدی حسن، اقبال بانو، بیگم اختر، غلام علی اور ملکہ پکھراج جیسے کانوں میں رس گھولنے والے فنکاروں نے خوب گائی ہے۔

(۴) فلموں کے نغمے۔۔۔۔فلموں میں گیت یا نغمہ لکھنے کے لئے فرازؔ کو بھی کئی بار آفر آئے مگر فرازؔ نے یہ کہتے

ہوئے صاف انکار کر دیا۔ مَیں بندشوں میں رہ کر نہیں لکھنا چاہتا یعنی کہ مشاعرے، رسالے اور گلو کار وغیرہ نے فراز کو ہر طبقے میں مقبول و عام کیا۔ یہ تو ان کے شہرت کی بات تھی مگر عزت فراز کو اپنے کلام کی خوبیوں کی وجہ سے ملی۔ جس کے قائل اہل نظر بھی ہیں۔

مَیں نے اپنے مقالے کی (احمد فراز کی شاعری کا تنقیدی جائزہ) ابواب بندی کچھ اس طرح سے کی ہے۔

باب اول} اس باب میں احمد فرازؔ کی زندگی کے حالات، شخصیت اور ان کے ماحول کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ فرازؔ کی ادبی زندگی کا آغاز، تعلیم، ملازمتیں، ان کے دوست واحباب اور ان کی شخصیت کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

باب دوم} اس بات میں فرازؔ کے سبھی شعری مجموعوں کا عمومی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ مجموعے کس سنہ میں شائع ہوئے؟ کہاں سے شائع ہوئے؟ مجموعوں کی ترتیب کیا ہے؟ اور فرازؔ نے کن اصناف سخن کو اپنے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے، وغیرہ

باب سوم} اس باب میں فرازؔ کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ فرازؔ کی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں؟ ان کی شاعری کی تخلیقی فضا کیا ہے؟ تشبیہات، استعارے، علامت نگاری، پیکر تراشی، محاکات، صنعتوں کے استعمال میں فرازؔ کے یہاں کتنی جدت ہے۔ ان کے یہاں عصری حسیت کس قدر ہے؟ ان کی فکر کیا ہے؟ غزلوں میں فرازؔ کی شخصیت کیسے اجاگر ہوئی ہے۔ نظموں میں وہ اپنے کس فکری پہلو پر زور دیتے ہیں، ان کے مسائل کیا ہیں؟ اور وہ اپنی شاعری کے حوالے سے دنیا کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں وغیرہ ان تمام پہلوؤں سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

باب چہارم} احمد فراز کی شاعری میں محبوب کا تصور، دراصل یہ باب نہیں بلکہ رسالے کے لئے مضمون لکھا تھا، جسے میں نے شامل کر لیا ہے۔

ماحصل۔۔۔۔اس حصے میں مندرجہ بالا ابواب کے تمام نکات کا مجموعی حیثیت سے احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

باب پنجم} اس باب میں عنوان کے تحت فرازؔ کے منتخب اشعار پیش کئے گئے ہیں۔

کتابیات

مَیں اپنے استادِ محترم پروفیسر مظفر شہ مری کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کیوں کہ وہ میرے صرف استاد ہی نہیں بلکہ مَیں انھیں آئیڈیل مانتا ہوں۔ ہاں ایک بات ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مَیں جب بھی خدا سے کچھ طلب کرتا ہوں تو ان میں اکثر یہ دُعا شامل رہتی ہے کہ علم کی جستجو میں بھٹکنے والے طلبہ کو خدا کچھ عطا کرے یا نا کرے مگر مظفر شہ میری جیسا ایک استاد اسے ضرور عطا کرے۔ وہ اس لئے کی

قائم رہے ہمیشہ صداقت کے واسطے
کھولی زباں کبھی نہ عداوت کے واسطے
کردار ہی کچھ ایسا ہے بے باک آپ کا
دُشمن بھی سوچتا ہے محبت کے واسطے

(آفتاب عرشی)

پروفیسر محمد انورالدین ، پروفیسر رضوانہ معین ،پروفیسر نسیم الدین فریس، پروفیسر خالد سعید، پروفیسر ابوالکلام، پروفیسر علی احمد فاطمی، استاد شاعر رحمن جامی، پروفیسر عباس رضا نیر، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد، ڈاکٹر عرشیہ جبین، ڈاکٹر اے۔ آر منظر، ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر نشاط احمد، ڈاکٹر شمس الہدیٰ، ڈاکٹر اکبر علی، ڈاکٹر مسرت جہاں، ڈاکٹر بی بی رضا، ڈاکٹر امین اللہ، طاہر اقبال، حسن تشنہ دیگر اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جن کی محبت اور شفقت کی وجہ سے میں اس قابل ہوا۔

آخر میں اپنے دادا جی منشی محمد بشیر صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے میری تربیت اور تعلیم کو جلا بخشی۔ مگر افسوس میرے تحقیق کے دوران ہی میں وہ اس دنیائے فانی سے ۱۳ر نومبر ۲۰۱۰ء کو کوچ کر گئے۔ انشاءاللہ المستعان خدا ان پر اپنے کرم کی بارش کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔

آمین

آفتاب عرشی

آفتابِ روشن

آفتاب عرشی ہمارے اُن چند ریسرچ اسکالروں میں سے ایک ہیں، جن کے نزدیک تحصیلِ علم کا مطلب سند یافتہ ہونا نہیں، بلکہ خود سند بن جانا ہے۔ چاہے اس کے لیے اُنھیں جتنی محنت کرنی ہو وہ کریں گے۔ بایں وجہ میں نے اُن سے خوب محنت کروائی اور اُنھوں نے بھی کمال صبر و استقلال کے ساتھ اپنا کام سر انجام دیا۔ مثلاً میں نے اُن کے ساتھ ایک تجربہ کیا، جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ تنقید شعر کے خصوص میں، علم بیان، صنائع و بدائع اور فکر شاعر وغیرہ کو اُجاگر کرنے کے لیے ہمیں احمد فراز کے عمدہ اشعار کا انتخاب کرنا تھا۔ ہم نے یہ طریقہ رکھا کہ پہلے وہ ہر عنوان کے تحت ستر پچھتر شعروں کا انتخاب کریں، بعد میں اُن میں سے پندرہ بیس کو نکال دیں، جو بچ جائیں اُن میں سے بھی دس پندرہ کو خارج کر دیں اور آخر میں چند عمدہ اشعار کو رہنے دیں۔ ردّ و قبول کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا، جب تک کہ احمد فراز کے وہی اشعار نہ بچ جاتے جو تازہ کار بھی ہوں اور مسترد کردہ شعروں کے مقابلے میں زیادہ معنی آفریں بھی۔ ظاہر ہے یہ بڑا محنت طلب کام تھا، مگر آفتاب نے اسے بڑی دلجمعی کے ساتھ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ اپنی کتاب کو بڑے اعتماد کے ساتھ منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔

آفتاب کے تعلق سے ایک بات یہ بھی عرض کر دوں کہ وہ بہت اچھے شاعر ہیں۔ یا یہ کہوں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ شاعر پہلے ہیں بعد میں کچھ اور۔ اگر آپ اس جواں سال شاعر کو پڑھیں گے تو لگے گا کہ آپ کسی کہنہ مشق اُستاد کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان تین چار برسوں میں اُنھوں نے اپنے فنّی سقوم پر بڑی حد تک قابو پالیا ہے اور اب وہ زیاد اعتماد کے ساتھ شعر گوئی میں مشغول ہیں۔ میری پسند کی اُن کی دو ایک ثلاثیاں درجِ ذیل ہیں:

روز ملتی ہے مجھ سے میلے میں
اِس طرح سے بھی کوئی ملتا ہے
زندگی مل کبھی اکیلے میں

☆

اِس طرح سے ذہن پہ چھائی ہے
نظم لپٹی ہوئی ہے سینے سے
یاد لیکن غزل کی آئی ہے

☆

رات پُونم میں چاندنی بکھری
دل کے غارِ حرا میں تب میرے
تیری یادوں کی آیتیں اُتری

☆

رشتہ یوں جوڑنے کو آیا تھا
دل کی دہلیز تک مجھے تیرے
چاند خود چھوڑنے کو آیا تھا

☆

خود ہی اپنے لہو کی پیاسی ہے
حادثوں نے یہ دن بھی دِکھلایا
ہر غزل اب تو بے لباسی ہے

یہ جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ احمد فراز کے چاہنے والوں کے لیے ایک خوب صورت تحفہ ہے۔آفتاب نے شاعر کی زندگی کے حالات اور اُن کے کلام کے فنی محاسن کو بڑی چابک دستی کے ساتھ جامعیت کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ اُنھوں نے تنقیدِ شعر کے خصوص میں بڑی ژرف بینی سے کام لیا ہے۔اس کے باوصف،موصوف نے احمد فراز کے مجموعہ ہائے کلام کو اُن کی تاریخِ اشاعت کے مطابق ترتیب دینے میں بڑی جاں فشانی کا ثبوت دیا ہے۔اس ضمن میں اُنھیں بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ایک کام آفتاب نے یہ بھی کیا ہے کہ اُنھوں نے احمد فراز کے عمدہ اشعار کو الگ سے یکجا کیا ہے تا کہ بہ یک نظر اُن کی تحسین کی جاسکے۔مجھے اُمیدِ قوی ہے کہ آفتاب عرشی کی یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی جس کا یہ استحقاق رکھتی ہے۔

پروفیسر مظفر علی شہ میری
سابق شیخ الجامعہ
ڈاکٹر عبدالحق اردو یونی ورسٹی، کرنول
آندھرا پردیش، ہندوستان

پیش گفتار

آفتاب احمد عرشی کو تب سے جانتا ہوں جب وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے بی۔ایڈ کر رہے تھے لیکن انھوں نے ایم فل حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی سے کیا اور آج کل Ph.D کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف ہیں۔زیرِ نظر مقالہ بعنوان ''احمد فراز کی شاعری کا تنقیدی جائزہ'' انھوں نے ایم فل کے لیے لکھا تھا جو شائع ہونے جا رہا ہے۔ایم فل کے مقالے کے لیے احمد فراز کا انتخاب کرنے کی بظاہر دو وجہیں نظر آتی ہیں، رومانس اور شاعری۔آفتاب احمد بھی شعر کہتے ہیں۔ان کا تخلص عرشی ہے۔اُن کے نام کے ساتھ تخلص دیکھ کر پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ وہ بھی بعضوں کی طرح محض تخلص کے گناہ گار ہوں گے۔لیکن ادھر دو ایک مشاعروں میں انھیں کلام پڑھتے ہوئے دیکھا بھی اور سنا بھی ہے۔عمر اور مزاج کی مناسبت سے ان کا کلام رومانی ہے اور اُسے ڈوب کے پڑھتے ہیں۔اور اپنے ہم عمر ساتھیوں میں وہ اردو داں ہوں کہ غیر اردو داں، ہر طبقوں میں بے حد مقبول ہیں۔یہ دیکھ کر جی خوش ہوا۔خوشی اس وقت دو بالا ہوگئی جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان سے شائع ہونے والے ادبی و نیم ادبی رسالوں میں چھپتے بھی رہتے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اپنی تحقیق کے لیے احمد فراز کا انتخاب، دو مناسبتوں کے سبب سے کیا ہے، عشق اور شاعری۔آفتاب نے مثالوں اور حوالوں کی مدد سے یہ ثابت کیا کہ احمد فراز کی شاعری کے دو محور ''غم جاناں'' اور ''غم دوراں'' ہیں۔آپ تو جانتے ہیں کہ یہ دو اصطلاحیں فیض کے نام اور کام کے ساتھ اس طرح سے جڑی ہوئی ہیں کہ اگر ہم انھیں کسی اور شاعر کے کلام کا وصف قرار دیں تو ہمارا ذہن بے ساختہ یہ تصور کر لیتا ہے کہ یقیناً وہ شاعر فیض کے رنگ میں کہتا ہوگا۔اس کا اپنا کوئی انداز نہیں ہوگا۔آفتاب نے فراز کے کلام کی مثالوں سے اور دیگر نقادوں کے حوالوں کی مدد سے بلکہ خود فراز کے اعتراف کو quote کرتے ہوئے اپنی بات کو مدلل بنایا ہے۔اس مقالے کا باب ''فراز کے کلام کا تنقیدی جائزہ'' ایک ابھرتے نقاد کا احساس دلاتا ہے۔اور یہ بھی محسوس کراتا ہے کہ آفتاب کو علم بدیع پر کامل دسترس نہ سہی، پر وہ اتنی تو واقفیت رکھتے ہیں کہ اس اوزار سے کلام کے تعین

قدر میں کس طرح سے کام لیا جاسکتا ہے۔ عرض کرنا یہی ہے کہ آفتاب احمد اپنی بات کو سلیقے سے پیش کرنا جانتے ہیں۔ سادہ لیکن سلیس نثر لکھنا جانتے ہیں اور یہی بات انھیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ اس مقالے کی اشاعت پر انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ وہ آگے کیا کریں گے میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ اپنا مطالعہ اور مضامین لکھنا جاری رکھیں تو تنقید میں اور شاعری میں ان کے لیے امکانات بہت پائے جاتے ہیں۔

پروفیسر خالد سعید
سابق صدر شعبہ (اردو)
مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی،
حیدرآباد، تلنگانہ 500032

چند باتیں

احمد فرازؔ ہمارے عہد کے اور سردار جعفری، کیفی اعظمی وغیرہ کے بعد کے بے حد مقبول و معروف شاعر ہیں۔ وہ عوام و خواص، ادب و مشاعرہ سبھی جگہ یکساں مقبولیت رکھتے ہیں۔ اب جبکہ شعر و شاعری خانوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ادب کا شاعر مشاعرہ میں نہیں جاتا اور مشاعرہ کے شاعر کو ادبی شناخت نہیں ملتی ہے۔ نیز عوامی مقبولیت کو بھی شعر و ادب کا معیار نہیں سمجھا جاتا۔ جبکہ بزرگوں کا خیال ہے کہ بڑی شاعری یا بڑا ادب وہی ہوتا ہے جو عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہو، پڑھا جائے اور سمجھا جائے۔ غالبؔ صرف اس لیے بڑے نہیں ہوئے کہ وہ مشکل شاعر تھے بلکہ اس لیے بھی عظیم تھے کہ ان کے اشعار اور مصرعے بطور محاورے زبان زد خاص و عام تھے اور آج بھی ہیں۔ شاعری جتنے وسیع دائرے میں پھیل کر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے اس کی قبولیت کے مدارج بھی اسی طرز سے پھیلتے چلے جاتے ہیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہوتا ہے جب شاعر ذات سے نکل کر کائنات میں پھیل جاتا ہے اور سارے جہاں کا درد اپنے قلب و جگر میں جذب کر لیتا ہے۔ ایک سینئر استاد کا شعر ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

پوری ترقی پسند شاعری کی شعریات و جمالیات اسی درد پر ٹکی ہوئی ہے۔ فیضؔ نے کہا تھا۔

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پر آئیں گے غمگسار چلے

احمد فرازؔ کی مقبولیت بھی اسی سلسلے کی توسیع ہے اور یہ وسعت و غیر معمولی مقبولیت انھیں اس لیے بھی ملی کہ ان کی رومانیت میں بھی انسانی درد کی شمولیت ہے اور ان کی مزاحمت میں بھی ملک و قوم کی سلامتی و بہبودی ہے۔ اور جو شاعر رومان میں حقیقت تلاش کر لے اُس کا ذہن اور نظریہ بہت دور تک جاتا ہے۔

احمد فرازؔ کی شاعری کا پورا پس منظر ترقی پسند جمالیات ہے اور پس منظر پاکستان کی صورتِ حال، لیکن یہ

صورت ایک ملک کی سرحد کو توڑ کر تمام مظلوم و مجبور سرحدوں میں داخل ہوجاتی ہے۔ اکثر اس نوع کی شاعری میں جدید قارئین کو خطابت یا نعرہ زنی کے آثار تو دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ آزار نہیں دکھائی دیتے۔ جو انسانیت کے بدن زخم بن کر رِس رہے ہوتے ہیں۔ اسی لیے اتنی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود مزاحمت کی شعریات کو اب تک ٹھیک سے سمجھا نہیں گیا۔

اچھی بات ہے کہ نوجوان ادیب آفتاب عرشی نے احمد فرازؔ کی شخصیت و شاعری کو نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے اس مختصر لیکن اہم مقالہ میں پہلے ان کی شخصیت اس کے بعد ان کی شاعری پر کارآمد گفتگو کی ہے۔ انھوں نے تفصیل سے ان کی نظموں پر گفتگو کی ہے لیکن اچھی بات ہے کہ غزلوں میں بھی عصری حسیت پاکستان کی سیاست اور عالمی صورت پر مفکرانہ وفنکارانہ انداز و افکار کو تلاش کیا ہے۔

آفتاب عرشی نے تفصیل میں جا کر فرازؔ کی شاعری کے افکار و ابعاد کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ان کے تجس و تلاش اور تنقیدی رجحان کا خوب خوب اندازہ ہوتا ہے۔ اس پہلی کوشش میں فکر و خیال اور ذہن و بیان کی پختگی و بالیدگی قابل مبارکباد ہے۔ بس یہی کہوں گا کہ عرشیؔ میاں پیچھے مڑ کر نہ دیکھئے گا ورنہ پتھر کے ہوجائیں گے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی
سابق شعبۂ اردو
الہ آباد، یونی ورسٹی
۸ر ستمبر ۲۰۱۵ء

آفتاب عرشی کی سنجیدہ نثر اور شاعری

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شاعری کرنے سے زیادہ مشکل کام نثر لکھنا ہے۔اس سلسلے میں میری ادنیٰ سی رائے کے مطابق چاہے شاعری ہو یا نثر، بہر حال انسان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس میں رنگ روغن بھرنا اور اپنے احساسات کا وسیلہ بنانا اہم بات ہوتی ہے۔ظاہر ہے جب تک انسان میں صلاحیت نہیں ہوگی وہ نہ لکھ سکتا ہے اور نہ شعر کہہ سکتا ہے۔ادبی تاریخ میں یہ بھی دیکھنے کو ملا ہے کہ بہت سے مشہور شعراء کی تعلیم بہت زیادہ نہیں تھی لیکن وہ شاعری بہت معیاری کرتے تھے اور ادب میں ان کا منفرد مقام ہے، وجہ یہ کہ شاعری موہوب الٰہی میں سے ایک ہے اور شاعر شعر کہنے کی صلاحیت آسمان سے لے کر آتا ہے۔ایسا نثر کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔پہلے ادب کو پڑھنا پڑتا ہے، تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے تب کچھ لکھا جا سکتا ہے۔آج کے دور میں جب سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سینیرٹی کی وجہ سے ترقیاں ہونے لگیں تب سے فضا ذرا بدل گئی اور باصلاحیت اور مخلص اساتذہ نہیں آرہے ہیں جو اپنے طلبا کو کچھ سکھانے کا جذبہ رکھتے ہوں۔آج اسکول کے اساتذہ مطالعہ کرنا نہیں چاہتے۔یونیورسٹی کی تو بات ہی الگ ہے۔وہاں اتنی سہولیات اور تنخواہیں ہیں کہ کیوں مزید پڑھا جائے۔

یہ فضا اردو اور ادب کے لیے اچھی نہیں۔شاید اسی وجہ سے آج وہ طلبا نہیں نکل رہے ہیں جن سے کچھ امیدیں کی جا سکتی ہیں۔یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہم، خاص طور پر مسلمان اردو بولنے اور سننے کو ترس جائیں گے۔آج کا حال سب جانتے ہیں کہ ہمارے گھروں سے اردو ختم ہوگئی۔انتہا یہ کہ اردو کی کھانے والے اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے اور کہتے ہیں کہ ان کا مستقبل کہیں تاریک نہ ہو جائے۔ایسے اردو والوں پر ملامت کرنے کو دل چاہتا ہے۔میرا ماننا ہے کہ آپ انگریزی اور دوسری زبانیں اور ٹکنکل کورس ضرور کرائیں لیکن اپنے بچوں کو اتنی اردو ضرور پڑھانی چاہیے کہ وہ اپنے مذہب اور اسلاف کے تذکروں کو پڑھ اور سن سکیں۔آج ہمارے گھروں سے اردو مر چکی ہے حتیٰ کہ شادی کے دعوت نامے ہندی میں شائع ہوتے ہیں اور قبروں پر ہندی میں نام لکھا ہوتا ہے۔

زوال اس سے زیادہ بتاؤ کیا ہوگا
فقیر شاہ سے اپنی قبا بدلنے لگے

میں عرض کر رہا تھا کہ اردو کی ترویج و اشاعت کی ذمہ داری ہم سب کی ہے کہ ہمارا سارا مذہبی سرمایہ اسی زبان میں ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ جو حال آج اقلیتوں کا ہے وہی اردو کا بھی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی پہچان ہیں۔ حکومتوں سے شکایت تو ہم ہمیشہ کرتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ میں جب اردو اکادمی، دہلی کا وائس چیرمین تھا تب میں نے ان اردو کے پروفیسروں، شعراء اور نام نہاد نقادوں کو قریب سے دیکھا جو بظاہر اردو کے قابل ترین لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ایک مقالہ یا کوئی مضمون لکھنے کے لیے اگر کہہ دیں تو ان کے پاس سات آٹھ مہینے تک وقت نہیں ہوتا تھا لیکن اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ایک سیمینار میں آپ کو مقالہ لکھنا ہے اور اس کے لیے آپ کو دو ہزار روپے پیش کیے جائیں گے تو فوراً ان کو فرصت ہو جاتی ہے۔ اس دوران اردو فروشوں کے ایسے ایسے چہرے سامنے آئے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شاید اسی سوچ اور عادت کی وجہ سے موجودہ حکومت نئی تعلیمی پالیسی لا رہی ہے جس میں نہ ہمارے مجاہدین آزادی ہوں گے اور نہ اردو کے متوالے اور شیدائی جنھوں نے زندگی بھر اردو کو پالا پوسا ہے۔ یہ میرا اردو کے تئیں درد تھا جو میں نے عرض کیا۔ کاش اردو کے چاہنے والے اس پر سنجیدگی سے غور کریں۔ ہو سکتا ہے میری یہ باتیں کسی کو تلخ لگیں لیکن اس کے لیے میں معافی نہیں مانگوں گا۔

موجودہ قحط الرجال کے دور کی ناہموار فضا میں اگر کوئی سنجیدہ اور مخلص شخص کچھ بہتر کرنے، لکھنے اور اردو کی اہم اور مشہور شخصیات پر کچھ تحقیقی کام کرنے کے لیے سوچے تو میری خوشی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور میں اس کے لیے نہ صرف دعا کرتا ہوں بلکہ کوشش کرتا ہوں کہ اس کی اس کوشش کو نہ صرف سراہا جائے بلکہ اس کی تہنیت اور حوصلہ افزائی بھی کی جائے۔ اردو دشمنی اور اپنے بزرگوں کو فراموش کرنے کے اس دور میں اگر کوئی دیوانہ کچھ کام کرنا چاہتا ہے تو ہم سب کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اس کا تعاون کیا جائے۔ نئی نسل میں جہاں اردو سے ناواقفیت اور بے روزگاری کی وجہ سے اپنی تہذیب سے دُوری ہو رہی ہے وہاں یہ ضرورت اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ اس مردہ پڑی زبان میں قلم چلانے والوں کی عزت کی جائے۔ اسی قدر افزائی اور خواہش کے طور پر یہ چند سطور حاضر ہیں کہ ایک نوجوان اور فعال ادیب اور شاعر ڈاکٹر آفتاب عرشی کی نثر کی نئی کتاب "احمد فراز کی شاعری کا تنقیدی جائزہ" پر کچھ لکھنے کی کوشش میں ہوں۔ نہ جانے انصاف کر پاؤں گا یا نہیں۔ ویسے ان کی شعری

تخلیقات میں ’’سوچ کی دہلیز‘‘ (نظمیں اور دوہے)، پیاسا دریا‘‘ اور ’’پاگل دیوانہ‘‘ خاصی مقبول ہو چکی ہیں ۔ان کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔غزل، نظم، دوہا اور ثلاثی وغیرہ میں انہیں خاصی مہارت حاصل ہے۔احمد فراز کی شاعری پر کچھ لکھنا بلکہ پوری کتاب شائع کرنا آسان کام نہیں، اس لیے کہ احمد فراز انقلابی شاعر کے ساتھ ساتھ غزل کے اہم ستون سمجھے جاتے ہیں ۔وہ نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان میں بھی بے حد مقبول ہیں ۔دہلی میں منعقد ایک مشاعرے میں انہوں ہندوستان پاکستان تعلقات کے حوالے سے بہت اہم اور بہترین نظم ’’تمہیں یہ گر و مہابھارتا لکھی تم نے ۔ہمیں یہ فخر کہ ہم کربلا کے عادی ہیں‘‘ نے مشاعرے کو لوٹ لیا۔میں اس مشاعرے میں خود موجود تھا۔ان کی اس نظم کے بعد دوسرے شعرا کچھ خاص تاثر نہ دے سکے۔ہندستان سے باہر بھی ان سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں لیکن میں ان سے بات نہیں کرسکا کہ وہ کبھی اس حالت میں نہیں رہے کہ کوئی بات کر سکے۔ویسے بھی میں الحمدللہ انگور کی بیٹی سے ہمیشہ دوٗر رہا۔ایک مرتبہ ہندوستان میں پاکستان کے کونسل خانہ کی جانب سے مشاعرہ منعقد ہوا۔ہندستان کے بیشتر شعراء وہاں موجود تھے، مجھے بھی بحیثیت شاعر مدعو کیا گیا تھا۔احمد فراز اس کی صدارت کر رہے تھے۔پاکستان کونسل خانہ میں میرا پہلی مرتبہ جانا ہوا تھا۔یہ دیکھ کر میں ششدر رہ گیا کہ وہاں کھانے سے پہلے مستقل پوچھا جارہا تھا کہ ’’آپ کون سا برانڈ لیں گے‘‘۔میرے لیے یہ نہایت افسوسناک منظر تھا۔ایک کونے میں احمد فراز نشے میں دھت پڑے تھے اور کچھ بات کرنے کے قابل نہیں تھے۔جب میں نے کوئی بھی برانڈ نوش کرنے سے منع کر دیا تو سفیر پاکستان خود تشریف لائے اور مجھ سے اصرار کیا۔میرے جواب ’’الحمدللہ میں مسلمان ہوں‘‘ سے شرمندہ ہو کر وہ واپس چلے گئے۔پورے مشاعرے میں احمد فراز کا یہی حال رہا اور وہ مشاعرے میں بمشکل اپنا کلام پڑھ سکے۔خیر

غزل کے احتجاجی لہجے کے طور پر احمد فراز نہ صرف ہندو پاک بلکہ دنیا میں اپنی خاص پہچان کے حامل تھے۔وہ اگر ضد پر آجائیں تو قیامت کی نظمیں کہیں اور اگر عشق کی واردات بیان کریں تو جدید و قدیم رنگ کی بے مثال تاریخ بنا دیں۔ان کی بہت سی غزلیں ہندو پاک کے اہم ترین گلوکاروں نے گائیں۔ان میں سب سے اہم مہدی حسن کا نام لیا جاسکتا ہے جنہوں نے احمد فراز کو اور زیادہ مشہور کر دیا۔اتنا بڑا شاعر ایسی قسمت لے کر آیا کہ اس کو زندگی میں سکون نہ مل سکا۔وجہ کچھ بھی رہی ہو احمد فراز یا مجاز لکھنوی جنہوں نے علیگڑھ کا لافانی ترانہ لکھا، زندگی کا سکون نہیں پا سکے، ویسے عام طور پر دنیا کی تاریخ دیکھ لیں تو بڑے فنکاروں اور دانشوروں کی زندگی اسی

کرب میں گزری اور شاید اس کشمکش زندگی کے حوالے سے ہی وہ پہچانے جاتے رہیں گے۔ فراز کے لہجے کی بلندی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کبھی حکومت کے سامنے سجدہ نہیں کیا اور حالات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بہ بانگِ دہل اپنی آواز بلند کی۔ اپنی شاعری میں الفاظ کے استعمال میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ ایسی ایسی ترکیبوں کا استعمال کرتے کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ حالانکہ وہ مذہبی علوم سے زیادہ قریب نہ تھے لیکن چند ایک نعتیں بھی کہنے کا انہیں فخر حاصل ہوا ہے جو ان کی بخشش کے لیے کافی ہے۔ جس طرح اللہ رب العزت تمام عالموں کا خدا ہے اسی طرح آقا محمد مصطفیؐ تمام عالموں کے لیے رحمت بن کر آئے۔ یقیناً یہ امید کی جانی چاہئے کہ جس شخص نے کلمۂ حق پڑھ لیا، اسے بہر حال جنت ملنا طے ہے، ہاں تھوڑا کان اینٹھ کر ہی سہی۔ ہم کسی کو جنتی یا دوزخی کہنے والے کون ہوتے ہیں۔ یہ خدا اور بندے کا معاملہ ہے۔ فراز کا یہ پہلو عام طور پر ان کے چاہنے والوں کے سامنے نہیں ہے کہ وہ ایک نرم دل انسان تھے۔ لاکھ کمیونزم کے قریب ہوتے ہوئے بھی جس معیار کے ساتھ انہوں نے نعت کہی وہ قابل ستائش ہے۔ حضورؐ کی نسبت اجالوں سے جوڑتے ہوئے انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر صبح کے حوالوں سے کیا ہے جو ایمان کی علامت کی ترجمان ہے۔ اپنے خیالوں سے حضورؐ کی مدح ممکن نہ کہہ کر انہوں نے اپنے ایمان کو اور بلند کر دیا۔ روشنی کے پیمبر سے تخاطب میں اپنی تاریخ کو شب ظلم کی مثالوں سے بیان کر کے فراز نے محبت رسولؐ کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔ غرض کہ شاعری کی ہر صنف میں انہوں نے طبع آزمائی ہی نہیں کہ بلکہ اس کو معراج تک پہنچایا۔ ہمارے عہد میں غزل کی پاسداری اور اعتبار کو احمد فراز نے وہ بلندی عطا کی جو انڈو پاک میں بہت کم شعرا کے حصے میں آئی ہے۔ سکوت شب میں اپنا پیام رکھنے اور ہجر کی رات میں بام پر ماہ تمام رکھنے کا سلیقہ احمد فراز کا کمال ہے۔ کوئے وفا میں آمد دوست کی نوید گرم تھی تو فراز نے چراغ سا دل سر شام رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ محبت اور عشق کی عظمت میں کیسے اضافہ کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں آج حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں جہاں ہم نہ اپنی تہذیب بچا سکتے ہیں اور نہ اپنی زبان۔ آج سے دس بارہ سال پہلے انڈو پاک کے اہم ترین شعرا اور فنکاروں کا ایک دوسرے کے ملک میں آنا جانا اور محبت اور انسانیت کی بات کرنا عام بات تھی لیکن اُس وقت حکومتیں بھی امن، مساوات اور قومی یکجہتی اور انسان دوستی کی سوچ رکھنے والی تھیں۔ شاید آج ہندوستان کو نظر لگ گئی کہ یہاں صرف مار کاٹ اور دشمنی، ہندو مسلمانوں میں نفرت پھیلانے کی بات کی جاتی ہے۔ کاش یہاں پھر ایسا ماحول پیدا ہو جائے کہ دل کو دل سے

ملا نے والوں کی حکومت ہو اور انسانیت اور مساوات کی بات کی جائے۔ برادر عزیز ڈاکٹر آفتاب عرشی کی نئی کتاب پر میں دل کی گہرائی سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے احمد فراز کی شاعری، شخصیت اور ان کے فن پر مختلف پہلوؤں سے نئے نئے نکتے نکال کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ گہرائی اور گیرائی اور عمیق مطالعہ کے بعد آفتاب عرشی احمد فراز کی شخصیت کے ہر پہلو تک گئے اور تنقیدی نقطۂ نظر سے اپنے قلم کو روشن کیا۔ ہندوستان میں احمد فراز پر بہت کم کام ہوا ہے۔ شاعر کسی قوم، ملک یا فرقے کا نہیں ہوتا۔ اس پر جتنا تحقیقی کام ہوگا اتنا ہی وہ عوام کے سامنے آسکے گا۔ میرے خیال میں آفتاب عرشی کی یہ کتاب نئے لکھنے اور جدید و قدیم شاعری کی بہترین مثال احمد فراز پر کام کرنے والوں کے لیے بہت معاون ثابت ہوگی۔ یہ مختصر سا مضمون، مضمون نہیں بلکہ میرے جذبات ہیں جو میں ہر بہتر لکھنے، سوچنے اور کوشش کرنے والے کے لیے رکھتا ہوں۔ ابھی آفتاب کو بہت کچھ کرنا ہے، لکھنا ہے اور ادب کی پاسداری کے چراغ روشن کرنے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ہی نہیں، اپنی زندگی میں سنجیدگی اور متانت کا عکس رکھتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کو اردو اور اپنی ہزاروں سال کی تہذیب سے روشناس کرانے کی کوشش کرتے رہیں۔

وہیں وہیں بڑی انسانیت ہوئی محسوس
جہاں جہاں بھی ملے ہیں مری زبان کے لوگ

۵/اگست ۲۰۲۱ء

ڈاکٹر ماجد دیوبندی، سابق وائس چیرمین، اردو اکادمی، دہلی

احمد فراز: ایک نظر میں

☆ اصلی نام سید احمد شاہ

☆ قلمی نام احمد فراز

☆ پیدائش ۱۴ر جنوری ۱۹۳۱ء صوبہ سرحد میں واقع نوشہرہ (پشاور) پاکستان

☆ والد سید محمد شاہ برق

☆ والدہ سیدہ امیر جان

☆ بھائی بہن سید محمود شاہ (بڑے بھائی مرحوم)

افتخار ناہید (چھوٹی بہن)

سید حامد شاہ (چھوٹے بھائی مرحوم)

سید مسعود شاہ کوثر (بار ایٹ لا (چھوٹے بھائی)

☆ اولاد تین بیٹے (سعدی فراز، شبلی فراز اور سرمد فراز)

☆ تعلیم ایم۔اے (اردو) ایم۔اے (فارسی)

☆ درسگاہیں اسلامیہ ہائی سکول کوہاٹ، ایڈورڈز کالج پشاور، پشاور یونیورسٹی، پشاور

☆ شاعری کا آغاز سکول کے زمانے میں (نویں دسویں جماعت سے)

☆ پہلا شعر

جب کہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لیے قیدی کا کمبل جیل سے

یا کئی جگہ یہ شعریوں بھی لکھا ملتا ہے

لائے ہیں سب کے کپڑے سیل سے
لائے ہیں ہمارے لیے کمبل جیل سے

☆ پہلی غزل

رُک جایئے کہ رات بڑی مختصر سی ہے
سن لیجئے کہ رات بڑی مختصر سی ہے

☆ پسندیدہ غزل

سُنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

☆ پسندیدہ نظم واپسی

☆ آخری غزل

غم حیات کا جھگڑا مٹا رہا ہے کوئی

چلے بھی آؤ کہ دنیا سے جا رہا ہے کوئی

ادارات داستان، خادم اور اشتیاق

✶ تصانیف

۱۔ تنہا تنہا ۱۹۵۸ء/ پاکستان
۲۔ دردِ آشوب ۱۹۶۶ء/ ایضاً
۳۔ نایافت ۱۹۷۰ء/ ایضاً

۴۔	شب خون	۱۹۷۱/ایضاً
۵۔	میرے خواب ریزہ ریزہ	۱۹۷۲/ایضاً
۶۔	جاناں جاناں	۱۹۷۶/ایضاً
۷۔	بے آواز گلی کوچوں میں	۱۹۸۲/لندن
۸۔	نابینا شہر میں آئینہ	۱۹۸۴ کینیڈا
۹۔	سب آوازیں میری ہیں	۱۹۸۵/سویڈن
۱۰۔	پس انداز موسم	۱۹۸۹/پاکستان
۱۱۔	بودلک (ڈرامہ منظوم)	۱۹۹۴/ایضاً
۱۲۔	خواب گل پریشاں ہے	۱۹۹۴/ایضاً
۱۳۔	غزل بہانہ کروں	۱۹۹۹/ایضاً
۱۴۔	اے عشق جفا پیشہ	

☆ شہرِ سخن آراستہ ہے (کلیات) ۲۰۰۴/پاکستان

بین الاقوامی ایوارڈ

- فراق انٹرنیشنل ایوارڈ ۱۹۸۲/ہندوستان
- بین الاقوامی ایوارڈ برائے
- زبان وادب ٹورنٹو اکادمی ادبیات ۱۹۹۱/کینیڈا جے این ٹاٹا ایوارڈ جمشید نگر
- برائے امن اور انسانی حقوق ۱۹۹۲/ہندوستان ۲۰۰۰ ملینیم میڈل آف
- آنرز یو۔ ایس۔ اے ۱۹۹۹/یو ایس اے
- کیفی اعظمی ایوارڈ ۲۰۰۲/یو اے ای
- ای ڈی وی کمالِ فن ایوارڈ ۲۰۰۴/انڈیا

قومی ایوارڈ

- آدم جی ادبی ایوارڈ　۱۹۶۶ر پاکستان
- اباسین ایوارڈ برائے ادب　۱۹۷۰ر پاکستان
- دھنک ایوارڈ　۱۹۷۱ر پاکستان
- ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ
- (اکادمی ادبیات پاکستان)　۱۹۹۰ر پاکستان
- نقوش ایوارڈ برائے ادب　۹۳۔۱۹۹۲ر پاکستان
- ستارۂ امتیاز برائے ادب　۱۹۹۴ر پاکستان
- (کمالِ فن ایوارڈ)
- اکادمی ادبیات پاکستان　۲۰۰۰ر پاکستان
- ہلالِ امتیاز برائے ادب　۲۰۰۴ر پاکستان
- ''ہلالِ امتیاز'' پرویز مشرف حکومت نے نوازا تھا، جسے فراز نے ۲۰۰۶ء میں حکومت کو واپس کر دیا۔

تراجم

- فراز کی شاعری کے تراجم۔ انگریزی، فرانسیسی، ہندی، یوگوسلاوی، سویڈش، روسی، جرمن اور پنجابی میں ہو چکے ہیں۔

سرکاری خدمات

- لیکچرر۔ پشاور یونیورسٹی　۱۹۷۱ء۔ ۱۹۶۱ء
- ڈائریکٹر۔ پاکستان نیشنل سینٹر　۱۹۷۶ء۔ ۱۹۷۱ء
- ڈائریکٹر جنرل۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹریچر　۱۹۷۸ء۔ ۱۹۷۶ء
- چیئرمین۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز　۱۹۹۰ء۔ ۱۹۸۹ء
- چیف ایگزیکیوٹیو لوک ورثہ　۱۹۹۳ء۔ ۱۹۹۱ء

- مینیجنگ ڈائریکٹر۔نیشنل بک فاؤنڈیشن ۲۰۰۵ء۔۱۹۹۴ء

ریکارڈنگ

- اثاثہ (وڈیو کیسٹ) دوبئی محاصرہ (لانگ پلے) لندن
- یہ میری نظمیں یہ میری غزلیں (ای ایم آئی) پاکستان
- شاہکار غزلیں (کیسٹ) واشنگٹن امریکہ

سیمینار فنکشن

- اندرونِ ملک اور بیرون ملک دنیا کے تمام اہم ممالک میں منعقدہ ادبی سیمینارز اور فنکشنز میں شرکت کر چکے ہیں۔

نصاب میں

- علی گڑھ یونیورسٹی انڈیا
- پشاور یونیورسٹی پاکستان

پی۔ایچ۔ڈی مقالے

- احمد فراز کی غزل جامعہ ملیہ یونیورسٹی انڈیا
- احمد فراز فن اور شخصیت اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور پاکستان

ڈاکٹریٹ کی ڈگری

- آپ کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں یونیورسٹی آف کراچی نے 5-2-1995 کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

فیلوشپ

- آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اکادمی ادبیات پاکستان نے آپ کو آنریری لائف فیلوشپ عطا کی۔

فراز کارنر

- ۲۰۰۳ء میں سینٹرل لائبریری واہ کینٹ میں احمد فراز کارنر کا افتتاح ہوا۔

- رنگِ مزاج نیلا
- سٹار کیپری کارن
- سگریٹ ڈن ہل

پسندیدہ گلوکار

- نور جہاں، امانت علی خان، مہناز، فریدہ خانم، طاہرہ سید، سلمیٰ آغا

احمد فراز پر کتب

- احمد فراز۔فن اور شخصیت تاج سعید/ زیتون بانو ادارہ جریدہ پشاور
- احمد فراز شخصیت اور فن محبوب ظفر: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۶ء

کتب میں تذکرہ

- احمد فراز۔ پاکستانی اردو ادب کی تاریخ: انیس ناگی جمالیات لاہور ۲۰۰۴ ص ۱۰۵

رسائل کے احمد فراز نمبر

- گوشہ احمد فراز ایوانِ اردو، دہلی اکتوبر ۲۰۰۸ء ہندوستان
- گوشہ احمد فراز عکاس اسلام آباد جلد ۱۶ شمارہ ۴۔ ۲۱،۸،۲۰۰۸ء پاکستان
- احمد فراز نمبر آن کوٹ انگلینڈ
- احمد فراز نمبر سہ ماہی ادبیات اسلام آباد۔ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء پاکستان
- احمد فراز نمبر ماہِ نو لاہور۔ جنوری ۲۰۰۹ء جلد ۶۲ شمارہ۔ ا پاکستان

☆ **مرض الموت**......شراب نوشی کی وجہ سے جسم کا نظام بالکل خراب ہو گیا تھا۔ امریکہ کے شہر ”شکاگو“ میں مشاعرہ پڑھنے کے لیے گئے تھے۔ جہاں وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ ان پر ہارٹ اٹیک کا حملہ ہوا۔ بے ہوشی کے عالم میں تھے کہ ان کے بیٹے شبلی فراز نے انھیں امریکہ سے پاکستان راولپنڈی لا کر کے ”الشفا ہسپتال“ میں داخل کروا دیا۔ لیکن کوئی دوا کارگر نہ ہوئی، بالآخر انھوں نے ۲۵/ اگست ۲۰۰۸ء کی شب اس دنیا سے کوچ کیا۔

- احمد فراز نے کل (۷۷) سال (۷) مہینے اور (۱۱) دن کی زندگی پائی۔

شخصیت اور ماحول

احمد فراز کا تعلق ایک معزز سید خاندان سے ہے۔ ان کے جد امجد حاجی بہادر نامی ایک صوفی بزرگ تھے۔ فرازؔ کے والد آغا محمد شاہ برق کوہاٹی اردو، فارسی اور اپنی مادری زبان پشتو کے اچھے شاعر تھے۔ احمد فرازؔ نے ان کے گھر ۱۴؍ جنوری ۱۹۳۱ء کو صوبہ سرحد میں واقع نوشہرہ (پشاور) میں آنکھ کھولی۔ والدین نے سید انور شاہ نام رکھا۔ بعدازں وہ احمد شاہ کہلائے اور پھر دنیا ادب میں احمد فرازؔ کے نام سے مشہور ہوئے۔

احمد فرازؔ نے جس ماحول میں اپنی آنکھ کھولی وہاں بیدلؔ، سعدیؔ، حافظؔ، نظیریؔ اور غالبؔ وغیرہ کی شاعری کے چرچے دن رات ہوتے تھے۔ کیوں کہ فراز کے والد بذات خود ایک اچھے شاعر اور ان کی خود ایک انجمن (بزم سخن) تھی جہاں شاعری کی محفلیں اکثر برپا کی جاتی تھیں۔ ان محفلوں میں فراز بھی کبھی کبھی شامل ہو جایا کرتے تھے۔

فرازؔ نے ابتدائی تعلیم کوہاٹ میں حاصل کی۔ ایڈورڈ اسکول سے انٹر کیا۔ یہیں سے بی۔ اے کرنے کے بعد پشاور یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔

احمد فراز کو شاعری ورثے میں ملی تھی اور وہ خود بھی ایک پیدائشی شاعر تھے۔ بچپن میں ایک مرتبہ ان کے والد عید کے موقع پر کچھ کپڑے لائے تھے۔ مگر فراز کو وہ کپڑے پسند نہیں آئے۔ ان کے بڑے بھائی کے لیے جو کپڑے لائے گئے تھے وہ فراز کو اپنے کپڑوں سے بہتر نظر آ رہے تھے۔ اس وقت فراز نے یہ ایک شعر کہا (اگر اسے شعر کہا جائے تو) جس میں وزن نہ سہی ردیف قافیے کا اہتمام موجود تھا:

لائے ہیں سب کے کپڑے سیل سے
لائے ہیں ہمارے لیے کمبل جیل سے

؎۱

احمد فرازؔ بہت ہی شرمیلے اور اوسط درجے کے طالب علم تھے، ریاضی میں تو بہت کمزور تھے۔ چنانچہ ان کے والد نے اپنے ایک دوست کی لڑکی سے گرمیوں کی چھٹیوں میں فراز کو ریاضی سکھانے کو کہا۔ فرازؔ کو ریاضی سکھانے کے لیے وہ ان کے گھر آنے جانے لگی۔ اس نے ایک دن پوچھا کہ بیت بازی جانتے ہو؟

فرازؔ نے کہا نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ اس نے پھر پوچھا آپ کو شعر یاد ہیں۔ فرازؔ نے کہا میرے والد خود ایک شاعر ہیں مجھے شعر نہیں یاد رہیں گے؟ تو چلو بیت بازی کھیلتے ہیں میں تمھیں بتاتی ہوں بیت بازی کیا ہوتی ہے؟ ایک شعر میں کہوں گی اور آخر میں جس حرف پر شعر ختم ہوگا اس حرف سے آپ کو شعر کہنا ہوگا اور اس طرح سے یہ سلسلہ چلتا رہا۔

مگر بیت بازی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئی یعنی کہ تین چار اشعار کے بعد ہی فرازؔ کی شکست ہونا شروع ہوگئی۔ اب فرازؔ کو احساس ہونے لگا کہ شعر یاد ہونا اور بات ہے موقع پر شعر یاد آنا اور بات، مگر فرازؔ کو اُس لڑکی سے ہار جانا اپنے آپ میں بہت کمتری کا احساس ہوا اور لڑکی ہنستے ہوئے فرازؔ کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ اب کے جب میں آؤں گی، تو بہت سارے اشعار یاد رکھنا جتنے زیادہ اشعار یاد رہیں گے اس کھیل میں اتنا ہی زیادہ مزہ آئے گا۔ اُس لڑکی کے جانے کے بعد فرازؔ کو احساس ہوا کہ وہ اُس لڑکی سے بیت بازی میں نہیں بلکہ جیسے زندگی سے ہار گئے ہوں۔ چنانچہ ہار کو جیت میں بدلنے کے لیے فرازؔ نے گھر میں رکھے ہوئے شاعروں کا دیوان پڑھنا شروع کر دیا اور جب فرازؔ کو لگا کہ اب وہ اُس لڑکی سے بیت بازی میں جیت جائیں گے تو وہ پھر ایک بار بیت بازی کھیلنے بیٹھے۔ مگر پھر ہار کا سامنا کرنا پڑا، فرازؔ نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے مطالعے کو وسیع کیا، اور جب خود پر خوب یقین ہوا کہ اب ہار نہیں ہو سکتی تو ایک بار پھر وہ بیت بازی کھیلنے کے لیے اُس لڑکی کے ساتھ بیٹھے۔ تھوڑی دیر تک بیت بازی کا سلسلہ زور و شور سے چلتا رہا۔ مگر فرازؔ بیچ بیچ میں تھوڑی دیر بعد اٹکنے لگے۔ جب بھی لڑکی شعر کہتی پہلے تو فرازؔ اپنے حافظے کو ٹٹولتے اور جب کوئی شعر یاد نہ آتا تو وہ اپنے ذہن پر زور ڈالتے اور فوری شعر کہہ کر اس مشکل سے نکل جاتے۔ اس طرح وہ اپنی ہار کو جیت میں بدلتے رہے۔ اسی وقت کا یہ شعر بھی ہے:

رات کو ایک خواب دیکھا تھا
جس میں تیرا شباب دیکھا تھا

۲ے

شعر اعلیٰ درجے کا نہ سہی مگر ردیف بھی ہے قافیہ بھی اور وزن بھی درست ہے اور تک بندیوں کے اسی مشغلے میں وہ اُس لڑکی کے ساتھ بیت بازی کے معرکے فتح میں بدلتے رہے۔ مگر خود اس کے عشق میں

شکست کھاتے رہے۔اب ایک وقت ایسا آیا کہ لڑکی کا فراز کے گھر آنا بند ہوگیا اور فراز خود کو اس لڑکی کے لیے پریشان پانے لگے۔ایک دن فراز کو معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی شادی ہوگئی ہے۔اب فراز خود کو اکیلا محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ یہ محسوس کرنے لگے، کہ جو لڑکی میری کمزوری بن چکی ہے، اب میں اس سے نہیں مل پاؤں گا۔مگر کیا کرتے اب بیت بازی کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا تھا۔تو پھر فراز نے شاعری ہی سے کھیلنا شروع کر دیا۔

اس وقت تک فراز نویں جماعت سے کامیاب ہو کر دسویں کلاس میں آ گئے تھے اب انھیں یاد آیا کہ شاعروں کا کوئی تخلص بھی ہوتا ہے، پھر خود کو احمد شاہ سے احمد فراز بنالیا۔

احمد فراز شروع میں بہت ہی شرمیلے طالب علم تھے۔مگر اس لڑکی کو کھونے کے بعد ان کے دل ہی دل میں عشق کا شعلہ جواں ہونے لگا۔

فراز اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنے دوستوں کو شعر سناتے اور داد و تحسین پاتے۔لڑکیوں کا تو یہ عالم تھا کہ فراز سے اس حد تک متاثر تھیں کہ انھیں مجازی طرح خطوط لکھتی رہتی تھیں اور اپنے دل کی باتیں کہتی رہتی تھیں اور فراز بھی عشق میں غوطے لگاتے رہتے تھے اور اپنے اظہار خیال کے لیے شاعری کو ذریعہ بناتے رہے۔

احمد فراز خود معصوم مراد آبادی سے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''شاعری تو کالج کے زمانے میں شروع ہوئی۔ایک بیماری لگ جاتی ہے جسے عام طور پر عشق کہتے ہیں اس نے ہمیں خاصا متاثر کیا۔۔اور ہمیں شاعری کی طرف لے جانے میں عشق کا کافی عمل دخل رہا۔''[۳]

احمد فراز نے اپنا پہلا مشاعرہ زمیندار کالج گجرات میں پڑھا۔اسکول کے اساتذہ فراز کی شاعرانہ صلاحیت سے واقف تھے۔اسلئے انہیں جب مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا تو انہوں نے اپنا لہو جلایا اور مشاعرے کے لیے ایک غزل تیار کرلی۔جو بہت کامیاب رہی، جس کی وجہ سے فراز کو اس مشاعرے میں پہلا انعام ملا۔اب کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ احمد فراز شاعر ہے۔فراز نے ایڈورڈ اسکول سے نکلنے کے بعد بی۔اے کی تعلیم کے لیے کالج میں داخلہ لیا اور اسی درمیان بی۔اے کی تعلیم کے دوران ہی انہوں نے اپنا پہلا مجموعہ ''تنہا تنہا'' شائع کیا۔

بی۔اے کرنے کے بعد فراز نے پشاور یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم۔اے کیا اور گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے نوکری کی تلاش میں کراچی کی طرف نکل گئے۔اب وہ چاہتے تھے کہ نوکری ایسی جگہ ملے جہاں اردو سیکھنے کا موقع ملے۔اردو داں لوگوں سے ربط رہے۔کیوں کہ مادری زبان پشاوری ہونے کی وجہ سے فراز اردو لکھ تو لیتے تھے مگر بہتر طور پر بول نہیں پاتے تھے اور سب سے بڑی بات اردو میں شاعری کر رہے تھے۔اسی چکر میں وہ ریڈیو اسٹیشن کا چکر کاٹنے لگے ایک دو مشاعرے انھیں ملے اور لوگ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے معترف ہوئے تو انھیں اسکرپٹ رائٹر کے طور پر ملازمت کی پیش کش ہوئی جسے فراز نے فوراً قبول کرلیا۔انھوں نے ملازمت تو کرلی مگر وہ اپنی والدہ سے دور نہ رہ سکے۔وہ شب و روز ماں کے لئے تڑپتے رہے۔ساجد امجد لکھتے ہیں:

> "اس جاں فشانی کا پسینہ پونچھنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو پشاور بہت دور نظر آیا۔اسے اپنی ماں کی یاد آنے لگی۔وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اکیلا رہ گیا ہے رات کو کبھی آنکھ کھل جاتی تو گھنٹوں جاگتا رہتا۔اب وہ اس فکر میں تھا کسی طرح اس کا تبادلہ پشاور ریڈیو پر ہو جائے ملازمت بھی قائم رہے اور وہ اپنوں میں بھی پہنچ جائے بالآخر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو کر پشاور ریڈیو پر آگیا"[4]

اسی درمیان ان کی قابلیت و صلاحیت کو دیکھتے ہوئے پشاور یونیورسٹی کی طرف سے ایک خط آیا جس میں انہیں لکچررشپ کی ملازمت کا آفر تھا۔فراز نے دوستوں سے پوچھا کہ وہ کیا کرے۔کچھ تو ریڈیو ہی میں رہنے کا مشورہ دیا مگر زیادہ تر دوستوں نے کہا کہ وہ لکچررشپ کو قبول کرلے۔دوستوں سے ملنے کے لیے یوں بھی ریڈیو اسٹیشن آسکتے ہو اور اسطرح فراز نے اسکرپٹ رائٹر کی نوکری چھوڑ کر لکچررشپ قبول کرلی۔

لکچررشپ کی ملازمت میں آنے کے بعد انھیں فرصت کے اوقات بھی میسر آنے لگے۔کیوں کہ فرائض کے دوران زیادہ وقت نہیں تھا اور فراز نے اس فرصت کے اوقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا دوسرا مجموعہ "درد آشوب" اپنے پڑھنے والوں کے حوالے کیا۔فراز کو "آدم جی" ادبی ایوارڈ اسی مجموعہ پر ہی نوازا گیا تھا۔

پاکستان جب دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا تو اس وقت ملک میں مارشل لا لگا ہوا تھا مگر آدھا ملک

گنوا کر ہی سہی جمہوریت آئی اور پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی گویا یہ فرازؔ کے نظریات کی جیت تھی۔

ملک میں انتخابات ہوئے تو کالجوں میں طلبہ کی تنظیموں کے بھی انتخابات کا اعلان ہوا اور اس اعلان کے ساتھ ہی طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ بینر (Banner) آویزاں کیے گئے، دھواں دھار تقریریں ہونے لگیں۔ فرازؔ خوش تھے کہ جمہوریت کا یہ سفر تعلیمی اداروں تک آ گیا ہے۔

مگر ان سیاسی سرگرمیوں نے ایک ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ طلبہ کا ایک گروپ پرنسپل کے آفس میں گھس گیا۔ پرنسپل کو فحش گالیاں دیں ان کی بے عزتی کی، انھیں دھمکیاں دیں۔ فراز یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور حیران تھے کہ یہ کیسے شاگرد ہیں؟ استاد کے پاس دولت تو ہوتی نہیں صرف عزت ہوتی ہے اب تو عزت بھی گئی۔ وہ کس منھ سے لڑکوں کو پڑھائے، اور کیوں پڑھائے؟ انھوں نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا، کالج سے نکلے اور پھر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔ دوسرے دن انھوں نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ یوں یہ نوکری گئی ہاتھ سے۔

اب فرازؔ بے روزگاری کے دن گزار رہے تھے جسے انہوں نے آزادی کے دنوں سے تعبیر کیا ہے۔ کیوں کہ اب وہ نوکری سے آزاد ہو گئے تھے۔ لیکن نوکری نہ کرنے کی قسم بھی نہ کھائی تھی مگر یہ تو سوچ لیا تھا کہ اب نوکری اپنے معیار کی کریں گے اور اپنی پسند ہی کی نوکری کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے۔ لہٰذا جب "کونسل برائے قومی یک جہتی نیشنل سنٹر" میں ڈائرکٹر کی اسامی کے لیے درخواستیں طلب کی جا رہی تھیں تو فرازؔ نے بھی درخواست دے دی۔ اس وقت تک ان کی شہرت ملک کی دیواریں چھلانگ لگا کر بیرون ملک تک پہنچ گئی تھی۔ ادبی مقبولیت سے قطع نظر ریڈیو سے گائی جانے والی غزلوں نے اسے عوامی سطح پر پسندیدہ شاعر بنا دیا تھا۔

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آیا
اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں

ابھی درخواست کے بارے میں ضابطے کی کارروائی جاری تھی کہ پشاور سے لاہور جاتے ہوئے جہاز میں فرازؔ کی ملاقات فیض احمد فیضؔ سے ہوگئی سلام دعا کے بعد فرازؔ نے اپنی نئی ملازمت کا ذکر ان سے کچھ یوں کیا:

''فیض صاحب میں نے طے کرلیا تھا کہ سرکاری ملازمت نہیں کروں گا کیوں کہ افسران بالا کی تابعداری میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے لیکن یہ ملازمت درمیان میں آ گئی ہے میں درخواست بھی دے چکا ہوں لیکن تذبذب میں ہوں آپ بتائیے مجھے یہ ملازمت کرنی چاہیے یا نہیں؟

دیکھیے صاحب! فیض صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا آپ کے نوکری نہ کرنے سے یہ اسامی خالی نہیں پڑی رہے گی، تم نہیں کروگے تو کوئی جماعت کا بندہ آجائے گا دل پر جبر کرو اور یہ نوکری کرلو بلکہ میں تو یہ کہوں گا جہاں تک ممکن ہو اپنے لوگوں کو سرکاری ملازمتیں کرنی چاہئیں تا کہ ترقی پسند خیالات کو زیادہ سے زیادہ فروغ ملے''۔[۵]

اور پھر فرازؔ پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کے ڈائرکٹر بن گئے بعدازاں اکیڈمی آف فرنٹیسرز قائم ہوئی تو فراز کو اس کا پہلا ڈائرکٹر جنرل بنادیا گیا۔

پھر ۱۹۷۷ء میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد ایک باضمیر لکھنے والے کی حیثیت سے فراز نے فوج کے مظالم کے خلاف نظمیں لکھیں جس کی بنا پر نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا اور قید تنہائی میں رہنا پڑا۔

۱۹۸۱ء تک پاکستان میں اپنی بقا کے لیے کوشش کرتے رہے ۱۹۸۲ء میں ایک مشاعرے کے بعد سندھ میں فراز کے داخلے پر پابندی عائد کردی گئی۔ اس کے بعد ملک سے باہر جلاوطنی اختیار کرلی اور مختلف ملکوں میں (امریکہ، یورپ وغیرہ) کئی مہینوں تک گھومتے رہے۔

جب ملک کی سیاست میں تبدیلی آئی اور جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ احمد فرازؔ پاکستان واپس آئے۔ تو حکومت نے انھیں ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'' کا سربراہ مقرر کیا نیز مختلف اوقات میں مختلف ایوارڈوں سے نوازے گئے۔ ان کے دیگر ایوارڈوں میں'' آدم جی''۱۹۸۸ء ادبی ایوارڈ، بیسٹ شاعر ایوارڈ، اسی سال بھارت میں ''فراق گورکھپوری'' ایوارڈ، ۱۹۹۰ء میں ''اباسین ایوارڈ'' جوکہ اکیڈمی آف اردو لٹریچر (کینیڈا) ۱۹۹۱ء وغیرہ قابل ذکر ہیں

پھر دو جمہوری حکومتیں یکے بعد دیگرے آئیں اور چلی گئیں اور ایک مرتبہ پھر جنرل پرویز مشرف

کی قیادت میں فوجی حکومت آ گئی۔ مگر اس بار شروع میں فراز خاموش تھے۔ نہ کوئی آواز نہ کوئی احتجاج۔ یاروں کا دل پھر دھڑکا کہ کہیں فراز کی شاعری کا رخ ایک مرتبہ پھر پلٹ نہ جائے۔ مگر فراز اس بار غیر متوقع طور پر جنرل پرویز مشرف کی تعریف کرتے ہوئے نظر آئے۔ محفل یاراں میں ان کا یہ قول بہت دنوں تک گونجتا رہا کہ پاکستان کو پرویز مشرف جیسے حکمراں کی ضرورت تھی۔ ان کے ہم خیال دوستوں نے انھیں ضیاء الحق کا دور یاد دلایا کہ جب وہ گرفتار ہوئے تھے اور جلاوطنی اختیار کی تھی تو ان کے پاس اس کی بھی کچھ دلیلیں تھیں۔ جواب وہ کچھ اس طرح اپنی دلیلیں پیش کرنے لگتے:

"میں ضیاء الحق کی بات نہیں کر رہا ہوں جنرلوں، جنرلوں میں فرق ہوتا ہے پرویز مشرف فوجی ضرور ہیں، لیکن فوجی ہونا بری بات نہیں۔
تم تو کہتے تھے جنرل سب ایک طرح کے ہوتے ہیں؟
میں غلطی پر تھا اچھے برے سب جگہ ہوتے ہیں وہ باقاعدہ حمایت پر اتر آتا اور ایسی ایسی دلیلیں پیش کرتا کہ سب کو لاجواب کر دیتا۔"[6]

۲۰۰۶ء میں اسے مشرف حکومت نے "ہلال امتیاز" سے نوازا اور اس نے اسے قبول بھی کیا۔ دوستوں نے اسے پھر طنز کا نشانہ بنایا۔

"یار فراز تم اپنے موقف سے بالکل ہٹ گئے ہو تم نے ایک جنرل سے ہلال امتیاز قبول کر لیا۔
فراز: میں نے تو ایک فوجی کی دی ہوئی سزا بھی قبول کر لی تھی یہ تو ایوارڈ ہے۔"[7]

ایک انٹرویو کی پاداش میں انھیں "نیشنل بک فاؤنڈیشن" سے فارغ کر دیا گیا۔ اب فراز کو پھر ایک بہانہ مل گیا انھوں نے پرویز مشرف کو خط لکھا جس میں اپنی رنجشوں کا ذکر کیا اور محبت بھرے لہجے میں حمایت واپس لینے کی دھمکی بھی دے دی۔ مگر اس خط کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ روٹھے ہوئے محبوب کی طرح مشرف کے خلاف ہو گئے اور ۲۰۰۶ء میں مشرف سے ملے اور ہلال امتیاز ۲۰۰۶ء میں واپس کر دیا۔ اسی درمیان کراچی یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا جسے فراز نے گلے لگا لیا۔ ایک بار پھر ارباب حکومت نے ان کو گھر سے بے دخل کر دیا اس پر دانشوروں کی طرف سے بہت لے دے ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ زندگی کے آخری لمحات تک محبوب جہاں بنے رہے پوری دنیا کے

بڑے بڑے مشاعروں میں ان کی مانگ کا سلسلہ جاری رہا مگر شراب نوشی کی وجہ سے فرازؔ کے جسم کا نظام بالکل خراب ہو گیا تھا امریکہ شہر شکاگو میں بھی وہ مشاعرہ پڑھنے کے لیے ہی گئے تھے۔جہاں سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ ان پر جان لیوا بیماری نے حملہ کر دیا۔ان کے آخری لمحات کے متعلق ''انور سدید'' لکھتے ہیں:

''(شکاگو) احمد فرازؔ کے گردے بالکل خراب ہو چکے ہیں اس کا ڈائیلاسس ہو رہا ہے ۔بے ہوشی کے طبے دورے پڑ رہے ہیں، یاد داشت اور پہچان بہت کم ہو گئی ہے۔ پھر خبر آئی کہ'' افتخار نسیم'' نے وزیر اعظم پاکستان'' یوسف رضا گیلانی'' سے جو ان دنوں امریکہ میں دورے پر تھے درخواست کی تھی کہ احمد فرازؔ کو اپنے خصوصی طیارے سے پاکستان واپس لے جائے۔لیکن یہ درخواست ایوانِ اقتدار میں سنی نہ گئی تاہم چند روز کے بعد ان کے بیٹے شبلی فراز انھیں پاکستان لے آئے اور راولپنڈی کے الشفا ہسپتال میں داخل کرا دیا لیکن وہ ہوش میں نہ آئے اور بالآخر جب کوئی دوا کارگر نہ ہوئی تو وہ ۲۵؍اگست کی شب اس دنیا سے بستر حیات سمیٹ گئے''۔[۸]

احمد فرازؔ کی ایک دوست کشور ناہید نے ایک خط اخبار''ڈان'' میں اس وقت لکھا جب وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑے تھے:

''تمھیں اپنی عمر کا کتنا شعور تھا۔تم نے یہ بات کبھی پسند نہ کی کہ کوئی لڑکی تمھیں انکل کہہ کر مخاطب کرے۔تم کس کے محبوب نہیں ہو اور ہر شام گلاس ہاتھ میں تھام کر تمھیں کون یاد نہیں کرے گا۔''[9]

اس کے بعد جب فراز ریڈیو اسٹیشن پر نوکری کے لیے گئے تو وہاں زبان داں علم دوست، شاعر، ادیب وغیرہ زیڈ۔اے۔بخاری، شاہد احمد دہلوی، ارم لکھنوی، چراغ حسن حسرت جیسی باغ و بہار شخصیات موجود تھیں جن کی سرپرستی نے فرازؔ کے فن کو پہچانا اور اسے جلا بخشی۔فراز کو ریڈیو اسٹیشن میں ایسا ماحول ملا جس سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا اور فائدہ اٹھایا۔

معصوم مرادآبادی سے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

''زیڈ۔اے۔بخاری، شاہد احمد دہلوی، ارم لکھنوی، چراغ حسن حسرت وغیرہ جیسے لوگوں

کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا جن سے بہت کچھ سیکھا۔"١٠

گویا ریڈیو اسٹیشن جب فرازؔ آئے تو ان کے شاعری کا ذوق پوری طرح پروان چڑھ گیا۔ شاہدؔ احمد دہلوی خود ایک اچھے شاعر تھے اور ان سے بہت سے شاعر و ادیب ملنے آتے تھے جس سے فرازؔ نے بہت کچھ سیکھا، اور فائدہ اٹھایا۔

کالج کے زمانے میں فرازؔ کے پسندیدہ شاعر فیضؔ اور سردار جعفریؔ تھے۔ جن کے کلام کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا اور وہیں سے فرازؔ جمہوریت پسند انسان بنے، اور آمرانہ نظام کے مخالف ہوئے۔ "محاصرہ" ان کی مشہور نظم ہے جو کہ آمرانہ نظام کے خلاف آمرانہ رویوں کی بھرپور مزاحمت کی عکاسی کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں فرازؔ کو ١٩٧٧ء میں مانسہرہ کیمپ میں قید تنہائی میں رکھا گیا۔

اس قید تنہائی میں فرازؔ پر جو گزری اس کا عکس ان کی شاعری پر پڑا۔ قید تنہائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرازؔ کہتے ہیں:

آج دیوار کھنچ گئی ہے اگر
شہر کل بھی تھا صورتِ زنداں

قید تنہائی میں لکھی ہوئی ایک نظم "پہلی آواز" جو کہ اس وقت کے حالات کی غمازی کرتی ہے:

اتنا سناٹا کہ جیسے ہو سکوتِ صحرا
ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دہائی دی ہے
جانے زنداں سے ادھر کونسے منظر ہوں گے
مجھ کو دیوار ہی دیوار دکھائی دی ہے
دور ایک فاختہ بولی ہے بہت دور کہیں
پہلی آواز محبت کی سنائی دی ہے

قید و بند کے عہد نے فرازؔ کو شوریدہ اور باغی بنا دیا جس کا اثر ان کی شاعری پر گہرا نظر آتا ہے، مجموعہ "بے آواز گلی کوچوں میں" میں بہ طور زندان نامہ مربوط نظمیں اور غزلیں بھی کہی ہیں۔

''پچھلا پہر'' اس موڑ کی ایک نظم ہے جو قیدی اور احساس کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

نظم ملاحظہ ہو:

نہ کہیں شہرِ مہرباں کی ہوا
نہ کوئی یارِ ہمدم و دمساز
نہ سرِ بام زلفِ آوارہ
نہ سرِ راہ چشم فتنہ طراز
نہ کہیں کوئے چاک داماناں
نہ کہیں روئے دوستانِ فرازؔ
نہ کوئی بیتِ بیدلؔ و غالبؔ
نہ کوئی شعر حافظِ شیرازؔ
نہ کوئی شمع کشتۂ شب ہے
نہ کوئی عندلیب سینہ گداز
خلوتِ غم نہ بزم رسوائی
نہ سوالِ طلب نہ عرضِ نیاز
چار سو اک فصیل بے در ہے
چار جانب حصارِ بے انداز
نیند کے طائرانِ بے پروا،
شاخِ مژگاں سے کر گئے پرواز
ایسی ویرانیوں سے گھبرا کر
جب اٹھاتا ہوں تیری یاد کا ساز
توڑ دیتی ہے سلسلے سارے
پہرہ داروں کی بدنما آواز

جہاں ایک طرف قید تنہائی کا کرب ان کی شاعری میں ان کے حالات کے مطابق صاف طور پر جھلکتا ہے وہیں ان کی شاعری میں جلاوطنی کے دنوں کا بھی کرب دکھائی دیتا ہے۔ فراز فرماتے ہیں:

اے بے وطنی گواہ رہنا
ہر چند پھرا ہوں دربدر میں

جہاں فراز کو جلاوطنی میں بہت ساری اذیتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا وہیں جلاوطنی کی وجہ سے فراز کی مقبولیت، محبوبیت اور شہرت میں چار چاند بھی لگا۔ ان کی دربدری، یہی بے گھری، خانہ بدوشی، تخلیقی فکر و احساس کو نئے نئے تجربوں سے بھی ہمکنار کرتی رہی اور نئے منطقوں سے روشناس بھی۔ فراز کی شاعری میں وطن سے دور رہنے کا کرب وطن کی محبت کے جذبے صاف طور پر ظاہر ہوتے ہیں، اور ان کے حالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان کی ایک نظم "اے دیس سے آنے والے بتا" میں اپنوں سے دوری کا احساس وطن کی محبت کا کرب صاف طور پر جھلکتا ہے جو کہ فراز نے یہ نظم بلوماؤنٹ لیک نیویارک میں کہی تھی ملاحظہ ہو:

وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے اب اس کا نظارا کیسا ہے
ہر دشمن جاں کس حال میں ہیں ہر جان سے پیارا کیسا ہے
شب بزم حریفاں جمتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں
یاروں کی بسر اوقات ہے کیا ہر انجمن آرا کیسا ہے
کیا کوئے نگاراں میں اب بھی عشاق کا میلہ لگتا ہے
اہلِ دل نے قاتل کے لیے مقتل کو سنوارا کیسا ہے
کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگھرو ہیں ہوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں اب وقت کا دھارا کیسا ہے
قاصد کے لبوں پر کیا اب بھی آتا ہے ہمارا نام کبھی
وہ بھی تو خبر رکھتا ہوگا یہ جھگڑا سارا کیسا ہے
جب بھی میخانے بند ہی تھے اور وادیِ زنداں رہتا تھا
اب مفتیِ دیں کیا کہتا ہے موسم کا اشارہ کیسا ہے

میخواروں کا پندار گیا اور ساقی کا معیار گیا
کل تلخیٔ مے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے
ہر ایک کشیدہ قامت پر کیا اب بھی کمندیں پڑتی ہیں
جب سے وہ مسیحا دار ہوا ہر درد ب کا مارا کیسا ہے
کہتے ہیں کہ گھر اب زنداں ہیں سنتے ہیں کہ زنداں مقتل ہیں
یہ جبر خدا کے نام پہ ہے یہ ظلم خدارا کیسا ہے
یہ شامِ ستم کٹتی ہی نہیں یہ ظلمتِ شب گھٹتی ہی نہیں
میرے بدقسمت لوگوں کی قسمت کا ستارا کیسا ہے
پندار سلامت ہے کہ نہیں بس یہ دیکھو یہ مت دیکھو
جاں کتنی ریزہ ریزہ ہے دل پارا پارا کیسا ہے

جلا وطنی کے دوران فرازؔ نے اپنی کتاب "بے آواز گلی کوچوں میں" اپنے پڑھنے والوں کے حوالے کی اور اسی طرح "نابینا شہر میں آئینہ" مانٹرل پال سے شائع ہوئی وطن سے دوری کے تجربے نے فراز کے فکر کے نئے نئے دریچے کھول دیے اور فرازؔ کی شخصیت نے بیرونی شعرا کو ایسا متاثر کیا کہ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کی شاعری کے تراجم ہوئے جس کی وجہ سے فرازؔ قومی سے بین الاقوامی شاعر بن گئے۔

پاکستان میں فیضؔ کے بعد جبر واستحصال واعلیٰ اقدار انسانی حیات کی بے حرمتی کے خلاف سب سے بلند آواز فراز کی ہی تھی، فراز شاعر کے ساتھ ساتھ سچے انقلابی اور سچے عاشق بھی تھے۔ فرازؔ ہمیشہ دلوں کو جوڑنے کی بات کرتے تھے، انسانیت دوستی کے امین ہونے کی وجہ سے ملک کی تقسیم نے انھیں متاثر کیا۔ جسے انھوں نے انسانیت وثقافت کا بٹوارہ سمجھا۔ مگر ان سب کے بعد بھی وہ ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ ہندوستان و پاکستان میں ہمیشہ بھائی چارگی، دوستی قائم رہے، فرازؔ کی نظم "سرحدیں" ملک کے تقسیم کے ساتھ ساتھ اپنوں سے دوری کے کرب کو نمایاں کرتی ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

کس نے دنیا کو بھی دولت کی طرح بانٹا ہے
کس نے تقسیم کیے ہیں یہ اثاثے سارے

کس نے دیوار تفاوت کی اٹھائی لوگو
کیوں سمندر کے کنارے پہ ہیں پیاسے سارے

فرازؔ صرف پاکستان کے سیاسی حالات سے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں، جہاں جہاں انسانیت پر ظلم ہوئے وہ چاہے فلسطین ہو یا لبنان، عوام کو آمریت نے اپنے ظلم و جبر کا نشانہ بنایا تو احمد فرازؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے ان کے خلاف آواز بلند کی۔ اس طرح کے موضوعات پر ان کی نظمیں "شہر کے سورج"، "محاصرہ"، "بیروت"، "دوسری ہجرت" وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جو کہ عصری حالات کی منظر کشی کرتی ہے۔ فرازؔ کو اسی حق گوئی کی وجہ سے سچائی بیان کرنے کی سزا کے طور پر جلاوطن ہونا پڑا تھا۔۔ مگر فراز نے حق گوئی کا ساتھ نہیں چھوڑا اور پاکستان میں ۱۹۷۷ء کی سیاست نظام کی تبدیلی، جمہوریت، انصاف، مساوات، انسانی بنیادی حقوق اور عوام کی سوچ کی آزادی کو بدل دیا اور فوجی نظام کو بدل کر رکھ دیا۔

طاہر محمد خان لکھتے ہیں:

"یہ بات کسی بھی باشعور کے لیے قابل قبول نہیں تھی، لیکن فراز نے اسے اپنا مشن بنا دیا۔ کیوں کہ وہ فکری طور پر آمرانہ اور فوجی نظام کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔"[۱۱]

یہی وجہ تھی کہ جب مشرقی پاکستان پر فوجی کارروائی ہوئی تو چاروں طرف انسانی اقدار بکھرتی ہوئی نظر آئی، ہزاروں لاکھوں آدمی مارے گئے تو فرازؔ نے کہا:

پیشہ ور قاتلو تم سپاہی نہیں

فرازؔ قلم کو یعنی اپنے فن کو شاعری کو انسانی نسل کی امانت سمجھتے ہیں۔

سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

"احمد فراز کہتے ہیں کہ اس دورِ ستم میں شاعر، تخلیق کار اور تمام اہلِ علم کو فن کی حرمت اور قلم کی آبرو بچانے کی جدوجہد کرنی ہے۔ فن اور قلم انسانی نسل کی امانت ہیں۔ آزادی فکر و نظر اور آگہی کا ورثہ نئی نسل تک پہونچانا ان کی ذمہ داری ہے۔"[۱۲]

تبھی تو فرازؔ کہتے ہیں:

میرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
میرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے

فراز نے اپنے عہد کی منافقت، سیاسی ریاکاری کو جگہ جگہ بے نقاب کیا، اور ہمیشہ جمہوریت کا ساتھ دیا ہے۔ فراز نے گرتے ہوئے لوگوں کو سہارا دیا، اسی وجہ سے فراز کی دانست میں بھٹو آزادی فکر ونظر، جمہوری دوستی اور انسانی اقدار کا سمبل بن گئے تھے۔ ہندوستان میں جمہوری نظام کی وجہ سے فراز بہت متاثر تھے۔

فراز نے معصوم مرادآبادی سے ایک انٹرویو میں ہندوستان میں جمہوری نظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آپ کا ملک مجھے اس لیے بھی پسند ہے کہ یہاں جمہوریت ہے، اخباروں کو آزادی ہے، میں جب پہلی مرتبہ یہاں آیا تو مجھے اس چیز نے بڑا متاثر کیا کہ یہاں کے اخبارات آزاد ہو کر لکھتے ہیں۔''[۱۳]

یوں تو پاکستان میں کبھی ادیب اور شاعر کو آزادی حاصل نہیں رہی۔ فراز سے پہلے فیض کی بھی یہی صورت حال تھی گویا ہر دور میں شاعر و ادیب کو سچ کہنے کے لیے شدید مشکلات سے گزرنا پڑا۔ فراز کے عہد میں ۱۹۷۷ء کے بعد پاکستان میں سچ بولنا بہت مشکل ہو گیا تھا انکے مندرجہ ذیل دو اشعار اس دور (۱۹۷۷ء۔ ۱۹۸۸ء) کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں:

آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
اور زخمِ جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا
دیکھ پندار ان آشفتہ سروں کا کہ جنھیں
بخت منصور ملا تخت سکندر نہ ملا

ضیاالحق کے دور میں دس برس تک پاکستان میں انسانیت کا لہو بہایا جارہا تھا، سول سوسائٹی جمود د قیود کا شکار رہی، سرکشی پر شہریوں کو زبوں کیا جاتا۔ اوجڑی کیمپ میں قیامت صُغرا رونما ہوئی۔ اوجڑی کیمپ کے عنوان سے فراز نے اس وقت کے سماجی حالات کا بھرپور جائزہ لیا ہے، فراز ان واقعات کو بیان کرتے ہیں:

جو روش ہے صاحب تخت کی
سو مصاحبوں کا طریق ہے

پاکستان میں ایک گروہ ہر وقت ایسا رہا ہے جس نے سچ بولا، حق کا ساتھ دیا وہ ہمیشہ درباروں سے دور نظر آئے مگر عہدے اور پیسوں کے لالچ میں سر نہیں جھکایا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کو سزا ہوئی، تو اسی ہفتے ضیاالحق نے اکادمی ادبیات کے نام سے دانشوروں اور قلمی نوکروں کو جمع کیا۔ بے شک ہزاروں موجود تھے، لیکن ہزاروں نے جانے سے انکار بھی کر دیا تھا۔ ضیاالحق نے ان کو بتایا کہ اس نے قبلہ درست کرنے کے لیے انھیں بلایا ہے لیکن ابھی ان کے قبر کی مٹی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ یہی لوگ بے نظیر کے دربار میں گئے اور نواز شریف سے بھی رسم و راہ بڑھائی، فرازؔ نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو
ہم لوگ نواگر ہیں ہمیں اذنِ نوا دو

فراز کی نظم "محاصرہ" پاکستان کی سیاست اور آمرانہ برائیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کی وجہ سے فراز کو جلاوطن کر دیا گیا تھا اور بھی فرازؔ کی کلیات میں بہت سی غزلیں، نظمیں ہیں جو عصری حالات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں۔

دنیا کے وہی ادب پارے آفاقیت کے حامل ہوتے ہیں جن میں تفکر اور عصری آگہی پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے ایسا تبھی ہو سکتا ہے جب شاعر میں انسانی جبلتوں اور معاشرتی رویوں وغیرہ کا ذکر ہو اور یہ سب چیزیں فرازؔ کے یہاں موجود ہیں۔ "محاصرہ" کے علاوہ "شہر نامہ"، "سرحدیں"، "اے میرے سارے لوگو"، "ندیم چہرہ"، "چلو اس شہر کا ماتم کریں"، "حرف کی شہادت" وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے فراز کی شاعری میں صرف عشق ہی نہیں بلکہ عصری حال پر بھی گہری نظر رکھنے کی دلیل ہے۔

احمد فرازؔ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی مادری زبان پشتو ہونے کی وجہ سے شروع میں فرازؔ اردو لکھ تو لیتے تھے مگر بہتر طور پر بول نہ پاتے تھے، جب ریڈیو اسٹیشن نوکری کرنے گئے تو وہاں ادیبوں اور شاعروں کا جماوڑہ تھا۔ شاہد احمد دہلوی، ارم لکھنوی اور بخاری وغیرہ جیسے زبان داں وہاں موجود تھے اور ساتھ میں

وہ شاعر و ادیب بھی تھے جن کی وجہ سے ارد گرد کے ادیب و شاعر ملنے آتے تھے جہاں دہلی تجھی اردو کے شاہکار نشر ہو رہے تھے گویا فراز ایسے ماحول میں آ گئے جہاں اہل زبان کا جم غفیر تھا۔ اردو بہتر طور پر نہ بول پانا، پشاور میں رہتے ہوئے فراز کو اپنی اس کمی کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب وہ کراچی میں تھے۔ اور وہ بھی ریڈیو اسٹیشن میں۔ یہاں رہ کر انھیں اپنی اس محرومی کا مسلسل احساس ہوتا تھا۔ کسی نے ایک دن مذاقاً ان سے کہا "طلسم ہوش ربا" پڑھو یا دہلی کی کسی لڑکی سے شادی کر لو اردو بولنا سیکھ جاؤ گے۔

ساجد امجد لکھتے ہیں:

> "شادی تو اس کے بس میں نہیں تھی وہ طلسم ہوش ربا کھول کر بیٹھ گیا سخت مطالعہ کیا اکیلے میں بولنے کی کوشش کی۔ ریڈیو پر آنے والے ادیبوں کے قریب رہنے کی کوشش کی۔ شاہد احمد دہلوی بڑے شفیق سرپرست تھے اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے اور اس کی اردو صاف ہوتی چلی گئی۔" [۱۴]

فراز نے کالج کے زمانے ہی سے اپنے ذوق کے مطابق فیضؔ، سردار جعفری کو پڑھنا شروع کیا۔ بعد میں بیدلؔ، غالبؔ، میرؔ، داغ، سراج اورنگ آبادی، اقبالؔ، نظیریؔ، حافظؔ، رومیؔ وغیرہ کی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے پسندیدہ شعرا کی زمینوں میں کامیاب غزلیں بھی کہی۔ اپنے ہم عصروں میں فرازؔ نے فیضؔ، سردار جعفریؔ، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، احمد ندیم قاسمی، ن۔م۔راشدؔ، ساحر لدھیانوی، اخترؔ الایمان، جان نثار اخترؔ جیسے شاعروں کا مطالعہ کیا اور فیض یاب ہوئے۔

احمد فرازؔ کے ہم عصروں میں ایک طرف تو ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالیؔ، صوفی غلام مصطفی تبسمؔ، منیرؔ نیازی، جیلانی کامرانؔ، شکیبؔ جلالی، مشفق خواجہ، امجد اسلام امجدؔ، کشور ناہیدؔ، پروین شاکر اور افتخار جالبؔ وغیرہ تو دوسری طرف خلیلؔ الرحمن اعظمی، شہریار، باقر مہدی، بشیر بدرؔ، ندا فاضلی، اخترؔ الایمان، روشنؔ صدیقی، جذبیؔ، وحیدؔ اختر، بانیؔ، مخمور سعیدیؔ، عرفانؔ صدیقی اور اسعدؔ بدایونی وغیرہ تھے۔ ان میں سے بہت سے بیشتر شعرا سے احمد فرازؔ کے بہت اچھے مراسم تھے۔ مشاعروں میں اکثر ان سے ملاقاتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

جسٹس افضال ظلہ کی عدالت میں اس مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی جو فرازؔ پر چل رہے تھے،

جب فراز کے بیان کی ضرورت پڑی تو انھیں کٹک سے لاہور لایا گیا تھا اور بند کمرے میں سماعت ہوئی تھی، سماعت کے موقع پر فراز کے عزیز شاعر دوست بھی وہاں موجود تھے۔

جمہوری نظام کا نظریہ رکھنے کی وجہ سے فراز کے ذوالفقار علی بھٹو سے بھی اچھے مراسم تھے ذوالفقار علی بھٹو کی جیت کو وہ اپنی جیت سمجھتے تھے۔ بھٹو کے دور میں فراز کو پاکستان میں سکون سے سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ ورنہ مارشل لاء کے دور میں فراز کو پاکستان میں بہت ہی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ انھیں جلاوطنی تک اختیار کرنی پڑی۔

احمد فراز اپنے دوستوں سے محبوب کی طرح تھوڑی تھوڑی باتوں پر روٹھ جاتے تھے، مگر پھر کچھ ہی دنوں بعد وہ خود ان سے ملنے جاتے اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے۔

اپنے ایک دوست کی عقیدت کو انھوں نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں اس طرح بیان کیا ہے جس کا نام ضیاء الدین تھا:

اتفاقاً بھی زندگی میں فراز
دوست ملتے نہیں ضیاء جیسے

یوں تو فیضؔ سے بھی فراز کے بہت اچھے مراسم تھے اور فرازؔ فیضؔ کی عزت اور ان کی عظمت کو سمجھتے تھے۔ فیضؔ سے فراز کو اس قدر عقیدت تھی کہ پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کے ڈائرکٹر کی نوکری کے لیے فرازؔ نے فیضؔ ہی سے مشورہ لیا تھا اور فیضؔ کے کہنے پر ہی فرازؔ نے یہ نوکری قبول کی تھی۔

فیضؔ کی عظمت اور عقیدت کو فرازؔ نے "بیادِ فیض" میں بیان کیا ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

قلم بدست ہوں حیران ہوں کہ کیا لکھوں
میں تیری بات کہ دنیا کا تذکرہ لکھوں
لکھوں کہ تو نے محبت کی روشنی لکھی
ترے سخن کو ستاروں کا قافلہ لکھوں
ترے بغیر ہے ہر نقش "نقش فریادی"
تو پھول "دست صبا" پر ہے آبلہ لکھوں

گرفتہ دل ہے بہت "شام شہرِ یاراں آج
کہاں ہے تو کہ تجھے حالِ دلبرا لکھوں

فیضؔ کے حوالے سے فراز معصوم مراد آبادی کے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

"فیضؔ صاحب سے آخری دنوں میں ہمارا بہت ساتھ رہا مجھے سب سے زیادہ اپنے ذہن وفکر سے جس شخص نے متاثر کیا وہ فیضؔ صاحب ہی تھے۔"۱۵؎

فرازؔ نے اپنی ایک طویل غزل میں کئی شعرا کا ذکر کرتے ہوئے شاعر دوستوں اور استاد شعرا کی عقیدت و والہانہ محبت کو بہت ہی بے باکی کے ساتھ بیان کیا ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میرؔ و انیسؔ و غالبؔ و اقبالؔ سے الگ
راشدؔ، ندیمؔ، فیضؔ سے رغبت کے رات دن

فردوسیؔ و نظیریؔ و حافظؔ کے ساتھ ساتھ
بیدلؔ، غنیؔ، کلیمؔ سے بیعت کے رات دن

شیلے کا سحر، کیٹسؔ کا دکھ بائرنؔ کی دھج
ان کافرانِ عشق سے نسبت کے رات دن

تشکیک و ملحدانہ رویے کے باوجود
رومیؔ سے والہانہ عقیدت کے رات دن

یہ اشعار فرازؔ کے احباب ن۔م۔راشدؔ، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیضؔ وغیرہ کی دوستانہ عظمت کو بیان کرتے ہیں تو ایک طرف فرازؔ نے استاد شعرا کا ذکر کیا جن سے وہ متاثر تھے تو کہیں یہ اشعار محبت و عقیدت کی غمازی کرتے ہیں۔

فرازؔ کے پسندیدہ شعراء میں سب سے پہلے فیض ہی کا نام لیا جاسکتا ہے کیوں کہ کالج کے زمانے میں فرازؔ کے پسندیدہ شاعروں میں فیضؔ اور علی سردار جعفریؔ جیسے ترقی پسند شعرا فراز کو بہت پسند تھے اور انھیں کی

شاعری فرازؔ کو انقلاب انگیزی کی طرف مائل کرتی تھی۔ یہیں سے فکر کے دروازے فرازؔ نے کھولے۔ رومانوی مزاج نے ان کی فکر اور آہنگ کو بہت متاثر کیا اور یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں نے فراز کو فیض کا جانشین قرار دیا ہے۔

فرازؔ کے پسندیدہ شاعر جن سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوئے۔ معصوم مرادآبادی سے ایک انٹرویو میں فراز فرماتے ہیں:

''اول تو میرے والد بذات خود شاعر تھے، وہ فارسی اور اردو کے اچھے شعر کہتے تھے۔ ان کی ایک انجمن بھی تھی ''بزم سخن'' گو کہ اس وقت مجھے شاعری سے کوئی شوق اور تعلق پیدا نہیں ہوا تھا، لیکن لوگ آتے جاتے تھے تو ہم کبھی کبھی وہاں شریک ہو جایا کرتے تھے لیکن جب کالج سے فارغ ہو کر کراچی ریڈیو اسٹیشن گیا تو وہاں بہت سی ادبی محفلیں ہوتی تھیں، بخاری صاحب علم دوست آدمی تھے اور خود بھی بڑے اچھے شاعر تھے، ان کے علاوہ اردگرد کے لوگ جو ان سے ملنے آتے تھے گویا ریڈیو اسٹیشن میں ایسے لوگوں کا مجمع رہتا تھا، جو ادبی دنیا میں خاص مقام رکھتے تھے۔ جن سے ہم نے بہت کچھ سیکھا، پھر کتابیں پڑھنی شروع کیں تو کلاسیکل لٹریچر تو سارے اپنے شوق سے پڑھا اور پھر کالج میں بھی پڑھا۔ اسی طرح ہمارے زمانے کے اچھے ادیبوں اور شاعروں نے بھی متاثر کیا مثلاً ہمارے یہاں احمد ندیم قاسمی، ن۔م۔ راشدؔ، فیضؔ پھر ادھر ساحرؔ لدھیانوی، اخترؔ الایمان، علی سردار جعفریؔ، کیفیؔ اعظمی، مجروح سلطان پوری، جان نثار اخترؔ جیسے لوگوں کو پڑھتے تھے بہرحال فیضؔ صاحب سے آخری دنوں میں ہمارا بہت ساتھ رہا مجھے سب سے زیادہ اپنے ذہن و افکار سے جس شخص نے متاثر کیا وہ فیضؔ صاحب ہی تھے۔''[16]

فرازؔ نے بہت سی غزلیں فیضؔ کی زمینوں میں بھی کہی ہیں۔ ایسی ہی ایک غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

فیض کا شعر ملاحظہ ہو:

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

فراز کا شعر ملاحظہ ہو:

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

فرازؔ بیدلؔ کی تخلیقی شخصیت اور شاعرانہ کردار سے بے حد متاثر تھے فرازؔ نے بیدلؔ سے وجدانی حرارت، عارفانہ بصیرت اور توانائی اظہار کا ہنر لیا فرازؔ کی مشہور غزل:

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

بیدلؔ ہی کی زمین پر فرازؔ نے لکھا ہے. جس کا مطلع یہ ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سر دمن در آ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ ، در دل کشا بہ چمن در آ

اس کے علاوہ اور بھی فرازؔ نے بہت سی غزلیں بیدلؔ کی زمین پر کہی ہیں۔

بیدلؔ کے بعد فرازؔ کے پسندیدہ شاعر غالبؔ ہیں جو کہ فرازؔ غالبؔ کی بھی شاعرانہ عظمت سے بہت متاثر تھے۔ غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یوں تو ہیں اور صحیفے بھی فرازؔ
ہم کو غالبؔ کا ہے دیوان عزیز

غالبؔ اردو شاعری کا ایک ایسا نام ہے. جس کی زمین پر کامیابی کے ساتھ شعر کہہ کر نکل جانا دوسرے شاعروں کے لیے. بہت مشکل ہوتا ہے. مگر فرازؔ نے غالبؔ کی مشہور غزل:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

کی زمین پر فراز کو یہ زمین اتنی پسند آئی کہ مسلسل غزل ہی کہہ ڈالی اور وہ بھی کامیاب غزل. جس کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

ہیں زخم بہت اور بھی دل پر مرے آگے
کوئی نہ کہے اس کو ستمگر مرے آگے
میں نے بھی کیا قصد سفر کا کہ غزل میں
غالبؔ سا طرح دار ہے رہبر مرے آگے
وہ صاحبِ دل ہوں کہ میری جان کا دشمن
تعظیم سے رکھ دیتا ہے خنجر مرے آگے

ایک اور غزل اسی زمین پر فرازؔ نے کہی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

کل شب تھا عجب دید کا منظر مرے آگے
دنیا تھی نہ ہونے کے برابر مرے آگے

لطف الرحمن فرماتے ہیں:

''یہ اشعار فراز کی تخلیقی شخصیت کی ریاضت اور مشق وممارست ہی کی طرف اشارے نہیں کرتے، بلکہ اس کی اپنی شعریات کی تعمیر کے ابعاد وآفاق کے حوالے بھی ہیں جنھوں نے فراز کے تخلیقی منشور کی الہامی تدوین کی ہے۔''[17]

اس کے علاوہ فرازؔ نے اور بھی بہت سی غزلیں غالبؔ کی زمین میں کہی ہیں اور اس طرح انھوں نے غالبؔ کے فکر وفن سے استفادہ کیا ہے۔

جہاں فرازؔ نے غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کو پسند کیا وہیں میرؔ کی دیوانگی بھی انھیں راس آئی ہے فرازؔ فرماتے ہیں:

میرؔ کے مانند اکثر زیست کرتا تھا فرازؔ
تھا تو وہ دیوانہ سا شاعر مگر اچھا لگا

فرازؔ کو اقبالؔ کی قربت نے روانی و برجستگی، سادگی و پرکاری کا پُر اثر لہجہ عطا کیا۔ اقبالؔ سے فرازؔ کی جمالیاتی قربت کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

جہاں اقبالؔ کہتے ہیں:

دیکھ آ کر کوچہ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو

وہیں فرازؔ فرماتے ہیں:

یونہی آئے نہیں ہیں کوچہ چاک گریباں میں
مزاج دل محبت کی ادا ہم بھی سمجھتے ہیں

یا جہاں اقبالؔ عصر حاضر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

وہیں فرازؔ فرماتے ہیں:

امیر شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنام وطن
خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ فرازؔ
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں

فراز کا مطالعہ گہرا تھا، وہ کالج کے زمانے ہی سے اپنے پسندیدہ شاعروں کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور ان کی زمینوں میں غزلیں بھی کہتے تھے۔ بیدلؔ، غالبؔ، میرؔ، اقبالؔ، فردوسیؔ، نظیریؔ، حافظؔ، داغ، روحی، فیضؔ، سردار جعفریؔ وغیرہ ان کے پسندیدہ شعرا کی فہرست میں آتے ہیں جن کے کلام نے فرازؔ کی رہنمائی کی جس نے ان کے فن کو شہرت، عزت اور توانائی بخشی۔ ان کی زندگی میں جو حالات آئے، ان کا مقابلہ کرتے ہوئے ان کی فکر کی تعمیر ہوئی۔ وہ جمہوریت کے قائل تھے۔ اس لئے فوجی حکومتوں سے ہمیشہ نبرد آزما رہے۔ مگر کبھی انھوں نے ظالموں کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ ان کی اس جنگ میں ان کے دوست واحباب اور ان کے اہلِ خانہ بھی ان

کے ساتھ رہے۔

حوالے:

۱۔ ''احمد فراز کی یادیں'' سید امتیاز الدین، احمد فراز نمبر۔ ہماری زبان انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، شمارہ ۷ ۴، ۴۶، ۴۵، ۴۴، جلد نمبر ۶۷، ۲۲ /نومبر تا ۲۵ /دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۶۱

۲۔ ''شاعر جاناں'' ساجد امجد رسالہ ''ہما'' دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۱

۳۔ ''احمد فراز سے ایک دلچسپ انٹرویو'' معصوم مراد آبادی، احمد فراز نمبر۔ ہماری زبان انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، شمارہ، ۷ ۴، ۴۶، ۴۵، ۴۴، جلد ۶۷، ۲۲ /نومبر تا ۲۵ /دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۷

۴۔ ''شاعر جاناں'' ساجد امجد ''ہما'' دہلی دسمبر ۲۰۰۸ء ص ۲۸۲

۵۔ ''شاعر جاناں'' ساجد امجد، ''ہما'' دسمبر ۱۹۹۶ء، ص ۸۵

۶۔ ''شاعر جاناں'' ساجد امجد، ''ہما'' دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۶

۷۔ ''شاعر جاناں'' ساجد امجد، ''ہما'' دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۶

۸۔ ''احمد فراز کے بارے میں'' انور سدید'' ہماری زبان ۲۲ نومبر تا ۲۱ دسمبر ۲۰۰۸ء ص ۹

۹۔ '' کچھ احمد فراز کے بارے میں'' انور سدید'' احمد فراز نمبر'' ہماری زبان انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۷ ۴، ۴۶، ۴۵، ۴۴، جلد ۶۷، ۲۲ /نومبر تا ۲۵ /دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۹

۱۰۔ ''احمد فراز سے ایک دلچسپ انٹرویو'' معصوم مراد آبادی'' احمد فراز نمبر'' ہماری زبان انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۷ ۴، ۴۶، ۴۵، ۴۴، جلد ۶۷، ۲۲ نومبر، ۲۱ /دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۷

۱۱۔ ''احمد فراز کا سماجی رویہ اور مزاحمتی شاعری'' طاہر محمد خان، ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۳

۱۲۔ '' کلامِ فراز میں عصری حسیت'' سیدہ جعفر، ایوانِ اردو، جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۹

۱۳۔ ''احمد فراز سے ایک دلچسپ انٹرویو'' معصوم مراد آبادی، ''احمد فراز نمبر'' ہماری زبان انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، جلد نمبر ۶۷، ۲۲ /نومبر، ۲۱ / دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۲

۱۴۔ ''شاعر جاناں'' ساجد امجد، ہما، دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۲

۱۵۔ ''احمد فراز سے ایک دلچسپ انٹرویو'' معصوم مراد آبادی، احمد فراز نمبر: ہماری زبان انجمن ترقی اردو ہند، نئی

دہلی، جلد نمبر ۶۷، ۲۲/نومبر، ۲۱/دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۷

۱۶۔ ''احمد فراز سے ایک دلچسپ انٹرویو'' معصوم مرادآبادی، احمد فراز نمبر: ہماری زبان انجمن ترقی اردو ہند، نئ دہلی، جلد نمبر ۶۷، ۲۲/نومبر، ۲۱/دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۷

۱۷۔ ''احمد فراز کی شعریات'' لطف الرحمن، احمد فراز نمبر: ہماری زبان انجمن ترقی اردو ہند، نئ دہلی، جلد نمبر ۶۷، ۲۲/نومبر، ۲۱/دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۳

احمد فراز کی شاعری کا عمومی جائزہ

احمد فراز کے کل مجموعہ ہائے کلام کی تعداد (۱۴) ہے، ۲۰۰۵ء تک فراز کے کل (۱۳) مجموعہ شائع ہو چکے تھے، جس کو فاروق ارگلی نے مرتب کیا تھا اور اس کے بعد ان کا آخری مجموعہ ''اے عشق جنوں پیشہ'' کو شامل کر کے فاروق ارگلی نے کلیات احمد فراز کے نام سے فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹیڈ سے شائع کیا۔ جس کا سائز ۱۶x۳x۲۳ ہے جو ۱۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے فاروق ارگلی نے جو کلیات احمد فراز ترتیب دی ہے وہ مجموعہ کلام کی ترتیب کے اعتبار سے ناقص ہے جس کی ترتیب یہ ہے[1]

﴿1﴾ جاناں جاناں

﴿2﴾ خواب گل پریشاں ہے

﴿3﴾ غزل بہانہ کروں

﴿4﴾ درد آشوب

﴿5﴾ تنہا تنہا

﴿6﴾ نایافت

﴿7﴾ نابینا شہر میں آئینہ

﴿8﴾ بے آواز گلی کوچوں میں

﴿9﴾ پس انداز موسم

﴿10﴾ شب خون

﴿11﴾ بودلک

﴿12﴾ یہ سب میری آوازیں ہیں

﴿13﴾ اے عشق جفا پیشہ

﴿14﴾ میرے خواب ریزہ ریزہ

فاروق ارگلی نے ان کے پہلے مجموعہ ''تنہا تنہا'' کو پانچویں نمبر پر رکھا ہے اور دوسرے مجموعہ ''درد آشوب'' کو چوتھے نمبر پر، اسی طرح سے انھوں نے سارے مجموعہ کلام کو ادھر ادھر کر دیا ہے۔ (بحوالہ کلیات احمد فراز)

جب کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے مضمون'' مطالعۂ احمد فراز کے چند حوالے'' میں انھوں نے مجموعوں کی ترتیب کچھ اس طرح سے دی ہے [۲]

﴿1﴾	تنہا تنہا	۱۹۵۸ء	پاکستان
﴿2﴾	درد آشوب	۱۹۶۶ء	پاکستان
﴿3﴾	نایافت	۱۹۷۰ء	پاکستان
﴿4﴾	شب خون	۱۹۷۱ء	پاکستان
﴿5﴾	میرے خواب ریزہ ریزہ	۱۹۷۲ء	پاکستان
﴿6﴾	جاناں جاناں	۱۹۷۶ء	پاکستان
﴿7﴾	بے آواز گلی کوچوں میں	۱۹۸۲ء	لندن
﴿8﴾	نابینا شہر میں آئینہ	۱۹۸۴ء	کینیڈا
﴿9﴾	سب آوازیں میری ہیں	۱۹۸۵ء	سویڈن
﴿10﴾	پس انداز موسم	۱۹۸۹ء	پاکستان
﴿11﴾	بودلک (ڈرامہ منظوم)	۱۹۹۴ء	پاکستان
﴿12﴾	خواب گل پریشاں ہے	۱۹۹۴ء	پاکستان
﴿13﴾	غزل بہانہ کروں	۱۹۹۹ء	پاکستان

''سخن آراستہ ہے'' کلیات جو کہ پاکستان سے شائع ہوئی تھی جو (۱۳) مجموعوں پر مشتمل ہے۔

فراز کا آخری مجموعہ ''اے عشق جفا پیشہ ہے، کہیں کہیں پر اس کا نام ''اے عشق جنوں پیشہ'' بھی لکھا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے مجموعہ کی شروعات ہی نظم ''اے عشق جنوں پیشہ'' سے ہوتی ہے۔

جب کہ ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اپنے مضمون'' صاحب ِکتاب (۴۶) احمد فراز'' میں ان کے مجموعوں کی ترتیب کچھ اس طرح سے دی ہے ۳؎

ا۔ تنہا تنہا	۲۔ درد آشوب
۲۔ نایافت	۴۔ جاناں جاناں
۳۔شب خون	۶۔ میرے خواب ریزہ ریزہ
۴۔ بے آواز گلی کوچوں میں	۸۔ نابینا شہر میں آئینہ
۵۔پس انداز موسم	۱۰۔ سب آوازیں میری ہیں (منظوم تراجم)
۶۔ بودلک	۱۲۔ خواب گِل پریشاں ہے
۷۔ غزل بہانہ کروں	۱۴۔ شہرِ عشق جنوں پیشہ (کلیات)
۸۔ اے عشق ِجنوں پیشہ	

اکثر ناقدوں نے فراز کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے مگر سبھی کے پاس ان کے (۱۴) مجموعوں کا ذکر نہیں ملتا۔کسی کے یہاں ۱۰ تو کسی کے یہاں ۱۱ریا ۱۲ رہی کا ذکر ملتا ہے۔اس لئے فراز کے مجموعوں کی صحیح ترتیب مشکل ہے۔

احمد فراز کے شیدایوں کی تعداد ہندوستان میں بھی ہونے کی وجہ سے ان کے کلام کی مانگ یہاں بھی رہی۔اس لئے کتابی دنیا، دہلی نے فراز کے مجموعوں کو شائع کیا۔مداحوں کی تعداد دن بدن بڑھنے کی وجہ سے کتابی دنیا، دہلی نے ان کے (۱۴) سبھی مجموعے کو یکجا کر کے'' کلیاتِ احمد فراز'' کے نام سے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔جس کو'' فاروق ارگلی'' نے ترتیب دیا۔جو ۱۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

1 ⟵ احمد فراز نے اپنا پہلا مجموعہ ''تنہا تنہا'' اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی شائع کیا تھا۔جسے انھوں نے اپنے ایک عزیز دوست ''ضیاء الدین'' جو خود ایک شاعر تھے اس کے نام معنون کیا تھا۔ضیاء نے ایک شعر فراز کے مجموعہ کے لیے کہا ہے:

ہاں مگر کوئی تمنا پس دامانِ وفا
مجھ سے پوشیدہ مرے پیش نظر ہوتی ہے

مجموعہ کے آخر میں فیض احمد فیضؔ نے فراز کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔یہ مجموعہ (۱۱۱) صفحات پر مشتمل ہے۔

2 ⟺ فراز کا دوسرا مجموعہ "درد آشوب" جس پر فراز کو بیسٹ شاعر اور آدم جی ادبی انعام سے نوازا گیا تھا۔اسی مجموعہ کلام میں فراز کی مشہور غزل "رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ" یا "اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں" وغیرہ غزلیں شامل ہیں جس کو گلو کاروں نے خوب گایا تھا اور فراز کی شہرت کو پاکستان کی سرحدوں سے پار کر دیا۔فراز نے اپنا یہ مجموعہ "محبوب اختر" کے نام معنون کیا تھا اور ایک شعر لکھا ہے:

فرازؔ　اپنے　سوا　ہے　کون　تیرا
تجھے　تجھ　سے　جدا　دیکھا　نہ　جائے

مجموعے کے آخر میں فراق گورکھپوری نے فراز کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے یہ مجموعہ (۱۱۹) صفحات پر مشتمل ہے۔

3 ⟺ فراز کا تیسرا مجموعہ "نایافت" ہے۔فرازؔ نے اس کا دیباچہ آزاد نظم کی صورت میں لکھا ہے۔اور انتساب میں یہ شعر تحریر کیا ہے۔

میں　تیرا　نام　نہ　لوں　پھر　بھی　لوگ　پہچانیں
کہ　آپ　اپنا　تعارف　ہوا　بہار　کی　ہے

یہ مجموعہ (۱۱۸) صفحات پر مشتمل ہے۔

4 ⟺ فراز کا چوتھا "مجموعہ "شب خون" ہے۔اس مجموعہ کلام میں ایک منظوم ڈرامہ ہے "سپاہی اور موت" کے عنوان سے۔جس کے کردار زخمی سپاہی، پہلا سپاہی، دوسرا سپاہی اور موت ہیں اور باقی غزلیں، نظمیں ہیں اس مجموعہ کلام کو فراز نے "ڈاکٹر محمد شفیق" کے نام معنون کیا ہے جو (۹۹) صفحات پر مشتمل ہے جس پر اظہار خیال "محمد علی صدیقی" نے کیا ہے۔

5 ⟺ فراز کا پانچواں مجموعہ "مرے خواب ریزہ ریزہ" ہے۔جب فراز پاکستان ریڈیو میں تھے، تو بہت سارے منظوم ڈرامے لکھے تھے، اُن ہی ڈراموں کو انھوں نے "مرے خواب ریزہ ریزہ" کے نام سے شائع کیا۔جو تعداد میں کل چار ہیں۔اس مجموعہ کو فراز نے "نصرت عظیم" کے نام معنون کیا ہے۔انتساب میں یہ شعر لکھا ہے:

میرے ہر نقش میں پنہاں ہے کہانی تیری
فن کی معراج ہے تصویر بنانی تیری

یہ ڈراموں کا مجموعہ (۱۵۱) صفحات پر مشتمل ہے جس پر اظہار خیال "قیوم نظر" نے کیا ہے۔

6← فراز کا چھٹا مجموعہ "جاناں جاناں" ہے اس مجموعہ کے شروع میں فراز نے ایک شعر لکھا ہے:

غزل میں جیسے ترے خدّ و خال بول اٹھیں
کہ جس طرح تری تصویر بات کرنے لگے

اسی مجموعہ کلام میں فراز کی مشہور نظم "قلم سرخرو ہے" شامل ہے جو اپنی عصری صورت حال کی وجہ سے اہمیت کی حامل ہے۔

7← فراز کا ساتواں مجموعہ "بے آواز گلی کوچوں میں" ہے۔ جس میں فراز کے قید تنہائی کی چند عبارتیں موجود ہیں۔ پاکستان کی سیاسی صورت حال کو بھی انھوں نے چند نظمیں "ایک بدنما صبح" کے عنوان سے پیش کیا ہے کتاب کے شروع میں یہ شعر لکھا ہوا ہے:

شہرِ غزل کی گلیوں میں دلگیر ترے
تجھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں
جم گیا ہے آنکھوں میں ایک بدنما منظر
اب تو سب کے سب چہرے قاتلوں سے لگتے ہیں

یہ مجموعہ کلام اپنے دور کی بھرپور عکاسی کرتا ہے پاکستان میں مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ سے جب تصوراتِ امن پاکستان کی صورتِ حال میں بڑا تفاوت پیدا ہو گیا تھا۔ فراز نے اپنے جذبات کا اظہار اسی مجموعے میں کیا ہے۔ اور مجموعہ "ڈاکٹر عطیہ" کے نام سے معنون کیا ہے اور ایک شعر بھی لکھا ہے:

شہر غزل کی گلیوں میں دلگیر ترے
تجھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں

یہ مجموعہ (۱۱۷) صفحات پر مشتمل ہے اسی میں ان کی مشہور نظم "محاصرہ" بھی ہے۔ جس کی وجہ سے فراز کو جلاوطنی اختیار کرنی پڑی تھی۔

8 ← فراز کا آٹھواں مجموعہ "نابینا شہر میں آئینہ" ہے جس کو انھوں نے "منصور جاوید" کے نام معنون کرتے ہوئے ایک شعر لکھا ہے:

فراز آج کی دنیا مرے وجود میں ہے
مرے سخن کو فقط میرا تذکرہ نہ سمجھ

اس مجموعہ کو فراز نے "ابیات" کے عنوان سے بہ حضور سرورِ کائنات کی شان میں چند اشعار سے شروع کیا ہے یہ مجموعہ کلام (۱۳۶) صفحات پر مشتمل ہے اس مجموعہ کلام پر اظہار خیال "مسعود مفتی" نے کیا ہے۔

9 ← "فراز کا نواں مجموعہ "یہ سب میری آوازیں ہیں" ہے۔ جو صرف آزاد نظموں پر مشتمل ہے یہ اصل میں ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو فراز نے فیض احمد فیضؔ کے نام معنون کیا ہے۔ اور اظہار خیال "احمد ندیم قاسمی" نے کیا ہے۔ اس میں کل (۱۲۵) صفحات ہیں۔

10 ← "فراز کا دسواں مجموعہ "پس انداز موسم" ہے۔ جس کو فراز نے احمد ندیم قاسمی کے نام سے معنون کیا ہے اسی مجموعہ کلام میں فراز کی مشہور نظم "شہر نامہ" (اوجڑی کیمپ کے والے) شامل ہے جسے پوری طرح سے پاکستان کا نوحہ کہا جا سکتا ہے یہ مجموعہ کلام (۱۵۲) صفحات پر مشتمل ہے جس پر اظہار خیال "کنور مہندر سنگھ بیدی سحر" نے کیا ہے۔

11 ← فراز کا گیارہواں مجموعہ "بودلک" ہے۔ اس مجموعے کو فرازؔ نے "ڈاکٹر رفیق جان" کے نام معنون کیا ہے۔ جس میں ایک طویل منظوم ڈرامہ ہے جس کا دیباچہ خود فراز نے لکھا ہے اور اظہار خیال "فارغ بخاری" نے کیا ہے۔ یہ منظوم ڈرامہ (۱۰۱) صفحات پر مشتمل ہے۔

12 ← فراز کا بارہواں مجموعہ "خواب گل پریشاں ہے" جس کو فراز نے "حمید اخوند" کے نام معنون کیا ہے۔ دیباچہ احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے اور ہندوستان کے مشہور شاعر مجروح سلطان پوری نے فراز کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے یہ مجموعہ کلام (۱۴۵) صفحات پر مشتمل ہے۔

13 ← فراز کا تیرہواں مجموعہ "غزل بہانہ کروں" ہے

14 ← فراز کا آخری (چودھواں) مجموعہ "اے عشق جفا پیشہ" یا (اے عشق جنوں پیشہ) ہے۔ اس

مجموعہ کا مقدمہ "احمد فراز کی شاعری" کے عنوان سے "پروفیسر شمیم حنفی" نے لکھا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں یہ شعر لکھا ہے:

اس سے بڑھ کر کوئی انعام ہنر کیا ہے فراز
اپنے ہی عہد میں اک شخص فسانہ بن جائے

احمد فراز کی کلیات میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی موجود ہیں۔ انھوں نے آزاد نظم، پابند نظم، اور طویل نظمیں لکھی ہیں مگر سب سے زیادہ ان کے کلیات میں غزلیں ہیں جن کے لیے وہ جانے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر فراز غزل ہی کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں غزل، طویل غزل اور عنوانات کے تحت یعنی شخصی غزلیں بھی موجود ہیں، متفرق اشعار میں صرف دو شعر ہی ان کے کلیات میں شامل ہیں۔

ان کی ایک غزل کا مطلع:

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

طویل غزل کا مطلع جس میں فراز نے (۶۱) اشعار لکھے ہیں:

چاہت کے صبح و شام محبت کے رات دن
دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

یا ایک اور غزل "من و تو" کے عنوان کے تحت لکھی گئی ہے جس میں فراز نے (۵۲) اشعار لکھے ہیں اس کا مطلع کچھ اس طرح ہے:

معاف کر مری مستی خدائے عز و جل
کہ میرے ہاتھ میں ساغر ہے میرے لب پہ غزل

عنوانات کے تحت لکھی گئی غزلیں میورکا (اسپین کا ایک خوبصورت جزیرہ)، اہل تاشقند کے نام، ایک مجسمہ دیکھ کر، نذر جالب، بطرز بیدل، نذر میر، بیاد فیض، تیرے بعد، رقص میں، نذر قرۃ العین طاہرہ وغیرہ شامل ہیں۔ فراز کی کلیات میں صرف دو ہی متفرق اشعار شامل ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

جسم بلور سا نازک ہے جوانی بھرپور
اب کے انگڑائی نہ ٹوٹی تو بدن ٹوٹے گا

☆

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

فراز کی کلیات میں نظمیں

ایک آزاد نظم: ''جب کی بات'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی ہے:

میں نے کہا تھا
دل کے سفر میں
یوں تو بہت سی منزلیں ہیں
لیکن
جاناں
تم سے آگے کوئی نہیں
آج مگر مجبورِ سفر ہوں

ایک پابند نظم: ''مجھ سے پہلے'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی:

مجھ سے پہلے تجھے جس شخص نے چاہا اس نے
شاید اب بھی ترا غم دل سے لگا رکھا ہو
ایک بے نام سی امید پہ اب بھی شاید
اپنے خوابوں کے جزیروں کو سجا رکھا ہو
میں نے مانا کہ وہ بیگانہ پیمانِ وفا
کھو چکا ہے جو کسی اور کی رعنائی میں

شاید اب لوٹ کے آئے نہ تری محفل میں
اور کوئی دکھ نہ رلائے تجھے تنہائی میں
میں نے مانا کہ شب و روز کے ہنگاموں میں
وقت ہر غم کو بھلا دیتا ہے رفتہ رفتہ
چاہے امید کی شمعیں ہوں کہ یادوں کے چراغ
مستقل بُعد بجھا دیتا ہے رفتہ رفتہ
پھر بھی ماضی کا خیال آتا ہے گاہے گاہے
مدتیں درد کی لو کم تو نہیں کرسکتیں
زخم بھر جائیں مگر داغ تو رہ جاتا ہے
دوریوں سے کبھی یادیں تو نہیں مرسکتیں
یہ بھی ممکن ہے کہ اک دن وہ پشیماں ہو کر
تیرے پاس آئے زمانے سے کنارا کر لے
تو کہ معصوم بھی ہے زود فراموش بھی ہے
اس کی پیماں شکنی کو بھی گوارا کر لے
اور میں جس نے تجھے اپنا مسیحا سمجھا
ایک زخم اور بھی پہلے کی طرح سہہ جاؤں
جس پہ پہلے بھی کئی عہد وفا ٹوٹے ہیں
اسی دوراہے پہ چپ چاپ کھڑا رہ جاؤں

یا ایک اور نظم ”شہر نامہ“ کے عنوان کے تحت لکھی گئی او جڑی کیمپ کے حوالے سے جو پابند نظم کے ساتھ ساتھ طویل نظم بھی ہے اس کے دو بند مندرجہ ذیل ہیں:

وہ عجیب صبح بہار تھی
کہ سحر سے نوحہ گری رہی

مری بستیاں تھیں دھواں دھواں
مرے گھر میں آگ بھری رہی
مرے راستے تھے لہو لہو
مرا قریہ قریہ فگار تھا
یہ کفِ ہوا پہ زمین تھی
وہ فلک کہ مشتِ غبار تھا

معریٰ نظم ''جاؤ'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی:

جاؤ کہ مجھے یقیں نہیں ہے
تم اب کے گئے تو آسکو گے
دہلیز سے اک قدم اتر کر
وہ راہ گزار منتظر ہے
جس پر جو کوئی چلا گیا ہے
قدموں کے نشاں بچھا گیا ہے
فرقت کے دیئے جلا گیا ہے

ایک اور نظم ''خواب'' کے عنوان سے تحت لکھی گئی:

وہ چاند میرا ہم سفر تھا
دوری کے اجاڑ جنگلوں میں
اب میری نظر سے چھپ چکا ہے
اک عمر سے ملول و تنہا
ظلمات کی رہ گزار میں ہوں
میں آگے بڑھوں کہ لوٹ جاؤں
کیا سوچ کے ... انتظار میں ہوں

کوئی بھی نہیں جو یہ بتائے
میں کون ہوں کس دیار میں ہوں

علاوہ ازیں فراز کی کلیات میں منظوم ڈرامے شامل ہیں۔ ان کا مجموعہ ''مرے خواب ریزہ ریزہ'' منظوم ڈراموں کا ہے۔ جس میں کل چار ڈرامے ہیں:

۱۔ روشنیوں کا شہر: جس کے کردار بوڑھا، آمنہ، خالدہ، سلمیٰ اور زاہدہ وغیرہ ہیں۔

۲۔ ساحل کی ریت: اس ڈرامے کے کردار سلیمان، ہمزاد، تبلیطہ ہیں۔

۳۔ موم کے پتھر: اس ڈرامے کے کردار بوڑھا، فریدوں، عالیہ، پروفیسر سیاح ہیں اور آخری ڈرامہ

۴۔ آخر شب کے ہم سفر: جس کے کردار سپاہی، عورت ہیں۔

''بودلک'' ان کا منظوم ڈرامہ ہے۔ جس کے کردار اس طرح ہیں۔

بودلک	:	وادی کا مضبوط بیٹا
قلش	:	بودلک کا فلسفی دوست
ژگولہ	:	بودلک کی منتخب دلہن
پیر دانا	:	وادی کا روحانی بزرگ

یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک طویل ڈرامہ ہے۔ جس کو فراز نے پاکستان ریڈیو کے لیے لکھا تھا اور یہ اسٹیج پر بھی کھیلا گیا تھا۔

حوالے:

۱۔ ''کلیاتِ احمد فراز'' ترتیب وتزئین'' فاروق ارگلی'' فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، دہلی

۲۔ کتاب بیادِ احمد فراز۔ مضمون'' مطالعۂ احمد فراز کے چند حوالے'' ''ڈاکٹر طاہر تونسوی'' کتاب اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء جلد ۴۱، ص ۱۲۷

۳۔ کتاب بیادِ احمد فراز۔ مضمون ''صاحب کتاب ۴۶ احمد فراز'' ''ڈاکٹر محمود الرحمٰن'' کتاب اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء جلد ۴۱، ص ۲۶۷

احمد فراز کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

احمد فرازؔ نے اپنے کلام کو طرح طرح کی خوبیوں سے مزین کیا ہے۔ انہوں نے کہیں تشبیہ اور استعارے سے کام لیا ہے، تو کہیں علامتوں اور صنعتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ مرورِایام کے ساتھ ان کی فکر میں جو تبدیلیاں آئیں، انھیں بھی انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اشعار کے روپ میں ڈھالا ہے۔ ذیل میں ان کی شاعری کا ایک تنقیدی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

احمد فراز نے اپنے کلام کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے تشبیہات کا خوب استعمال کیا ہے۔ انھوں نے جہاں روایتی تشبیہات کو نیا پیرہن دیا ہے۔ وہیں نئی نئی تشبیہات بھی تراشیں ہیں۔ مثال کے طور پر چند تشبیہات کے اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

اس قدر دنیا کے دکھ اے خوبصورت زندگی
جسطرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے

زندگی کی خوبصورتی کو یہاں تتلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور دکھوں کو مکڑی کے جال سے، جس طرح کوئی تتلی جب مکڑی کے جال میں پھنس جاتی ہے اور اس سے باہر نکلنا چاہتی ہے مگر نکل نہیں پاتی۔ ٹھیک اسی طرح فرازؔ نے دنیا کے دکھوں کو محسوس کیا ہے۔ فراز دکھوں سے باہر تو نکلنا چاہتے ہیں مگر دکھوں کے جالوں میں اس طرح سے پھنس گیے ہیں کہ باہر نکلنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

ایک اور تشبیہ ملاحظہ کیجیے۔

دن کے ڈھلتے ہی اجڑ جاتی ہے آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں

اس شعر میں فرازؔ نے آنکھوں کی ویرانی اور اپنی تنہا زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے ہجر کی کیفیت کو گاؤں کے بازار سے تشبیہ دی ہے۔ ایک عاشق دن میں دنیا کی بھیڑ میں گم رہتا ہے۔ مگر شام ہوتے ہی اس کے دل کا وہی عالم ہوتا ہے، جو کہ شام کے وقت گاؤں میں بازار کا ہوتا ہے۔ گاؤں کا بازار، اجڑی ہوئی آنکھیں ہی شعر کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔

ایک اور شعر۔

ہم ترے شوق میں یوں خود کو گنوا بیٹھے ہیں
جیسے بچے کسی تہوار میں گم ہو جائیں

یہ بھی ایک نئی تشبیہ ہے۔جس طرح کسی تہوار میں کوئی بچہ گم ہو جاتا ہے اور اپنے ماں باپ کو ڈھونڈتا رہتا ہے اُسی طرح فراز نے اپنے محبوب کی چاہت میں خود کو گم کر دیا ہے اور اپنے محبوب کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں،شعر کا حسن بچے کی معصومیت کی تصویر کشی میں پوشیدہ ہے۔جو ایک نئی تشبیہ ہے۔

یہ تشبیہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اک روپ کہ آئینہ تڑخ جائے
اک دھوپ رخِ نگار جیسی

اس شعر میں شاعر نے دھوپ کو محبوب کے رخ سے تشبیہ دی ہے۔جو ایک نئی بات پیدا کر رہی ہے۔

ایک اور شعر۔

پھر یوں ہوا کہ ساون آنکھوں میں آ بسے تھے
پھر یوں ہوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

اس شعر میں فراز نے درد کی شدت کو اس طرح سے محسوس کیا ہے کہ آنکھوں کا تو یہ عالم ہے کہ آنسو اس طرح سے بہتے جا رہے ہیں جیسے کہ ساون ہی آنکھوں میں بس گیا ہے،دل کے درد کا یہ حال ہے کہ دل اب دل نہیں بلکہ جیسے آبلہ ہو۔

ایک اور شعر۔

درخت ماؤں کی مانند انتظار میں ہیں
طیور لوٹ کے آئے نہ آشیانوں میں

فراز نے اس شعر میں درخت کو ماں سے تشبیہ دے کر ممتا کی بے لوث محبت کو نمایاں کیا ہے۔جس

طرح ماں اپنے بچوں کے انتظار میں شام کے وقت ان کی راہ دیکھتی رہتی ہے اور ذرا سی دیر ہونے پر بے چین و پریشان ہو جاتی ہے۔ اسی درد کی کیفیت کو فرازؔ نے درخت میں محسوس کی ہے کہ وہ بھی شام کے وقت اپنے بچوں (طیور) کے لیے بے چین و پریشان رہتے ہیں کہ آخر کیا بات ہے؟ ابھی تک طیور اپنے آشیانوں میں کیوں نہیں آئے۔

ایک اور شعر ۔

درد ایسا ہے کہ بجھتا ہے چمک جاتا ہے
دل میں اک آگ سی ہے آگ بھی جگنو والی

دل میں آگ بھری ہے جسے فرازؔ نے جگنو کی آگ سے تشبیہ دی ہے، جس طرح جگنو بجھتا ہے اور چمک اٹھتا ہے فرازؔ کے دل میں درد کی جو آگ بھری ہے اس کا بھی یہی حال ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بجھتی ہے او وقفہ وقفہ جلتی بجھتی ہے۔

ایک اور شعر ۔

غمِ دنیا تو وہ قلزم ہے کہ دل کا مضمون
غرق ہوتا چلا جاتا ہے کنارے کی مثال

قلزم کی گہرائی اور دنیا کے غموں کی گہرائی ایک جیسی ہے کہ جس میں انسان کی تمام خواہشات غرق ہو جاتی ہیں۔

ایک اور شعر ۔

ہر کوئی دل کی ہتھیلی پہ ہے صحرا رکھے
کس کو سیراب کرے وہ کسے پیاسا رکھے

فرازؔ نے اس شعر میں دل کو ہتھیلی سے تشبیہ دی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر شخص محبوب کا خواہش مند ہے۔ ایسے میں وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر وہ کس کے ساتھ کیا سلوک کرے؟ بڑا نادر خیال ہے۔

ایک اور شعر

کس دل آزار مسافت سے میں لوٹا ہوں کہ ہے
آنسوؤں میں بھی تپک پاؤں کے چھالوں جیسی

فرازؔ نے آنسوؤں کو پاؤں کے چھالوں سے تشبیہ دیتے ہوئے چھالوں کی تپک کو اپنے آنسوؤں میں محسوس کیا ہے جس سے تپک کی کیفیت نے شعر کو اپنی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔

ایک اور شعر

اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے

فرازؔ نے سائے کو دیوار سے تشبیہ دیتے ہوئے اپنے خوف کی شدت کو بیان کیا ہے۔

ایک اور شعر

مگر یہ درد طلب بھی سراب ہی نکلا
وفا کی لہر بھی جذبات کے بہاؤ کی تھی

یہاں وفا کی لہر کو جذبات کے بہاؤ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو اپنی مثال آپ ہے۔

ایک اور شعر

جسم بلور سا نازک ہے جوانی بھرپور
اب کے انگڑائی نہ ٹوٹی تو بدن ٹوٹے گا

جس طرح بلور نازک اور چمک دار ہوتا ہے اسی طرح محبوب کا جسم بھی نازک ہے اور اس پر جوانی بھی بھرپور ہے یعنی حسن اپنے پورے شباب پر ہے۔

ایک اور شعر

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

فرازؔ نے خواہش کو بارش سے تشبیہ دے کر اپنے غموں کی شدت کو بلندی پر پہنچا دیا ہے جسے یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ خواہش رو رہی ہے یا دل میں غموں کی بارش ہوتی ہے۔

ان تشبیہات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فرازؔ کے یہاں تشبیہات کا پہلو قوی ہے۔ ان میں جدت پسندی بھی ہے اور نیا پن بھی۔

کچھ اور مثالیں دیکھئے ۔

بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

☆

جیسے اک خواب سرائے سے گزر ہو تیرا
کوئی پازیب چھنک جاتی ہے گھنگرو والی

☆

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

☆

یہ مہربان مشیت بھی ایک ماں کی طرح
میں ضد کروں تو میری بات مان جاتی ہے

☆

سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اس کی
سنا ہے شام کو سائے گزر کے دیکھتے ہیں

☆

دیکھو اس چاہت کے پیڑ کی شاخوں پر
پھول اداسی کا ہے، ثمر افسوس کا ہے

☆

شاخِ امید پہ کھلتے ہیں طلب کے غنچے
یا کسی شوخ کے ہاتھوں میں حنا لگتی ہے

☆

یوں ان لبوں کے مس سے معطر ہوں جس طرح
وہ نو بہارِ ناز تھا خوشبو پیے ہوئے

☆

اب کے ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے دلوں پر تیر چلیں
اب کے گلابوں کا موسم بھی وار کرے تلواروں سا

☆

نہ مزاج ابر کرم کا ہے نہ علاج بارش غم کا ہے
تری دوستی کو میں کیا کروں، جو نہ دھوپ کی ہے نہ چھاؤں کی

☆

وداعِ یار کا منظر فرازؔ یاد نہیں
بس ایک ڈوبتا سورج مری نظر میں ہے

جہاں فرازؔ نے خوب تر تشبیہات تراش کر اپنی تخلیقی فضا قائم کی ہے۔ وہیں فرازؔ کے یہاں استعاروں کے نظام میں وہ بات نہیں ہے۔ چند ہی استعارے گنے چنے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جس میں نئی آواز، جدت پسندی جھلکتی ہے۔ ورنہ تشبیہات کے مقابلے میں استعاروں کا پہلو کمزور ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فرازؔ کے استعارے زیادہ تر علامتی لباس پہنے ہوئے ہیں اور استعارے کی کامیابی کے ضامن ہیں جو علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ پھر بھی گنے چنے چند استعارے درج ذیل ہیں، جن میں کلاسیکی رنگ چھایا ہوا ہے۔

جان نکلی کسی بسمل کی نہ سورج نکلا
بجھ گیا کیوں شب ہجراں کا ستارا جانے

یہاں سورج محبوب کا استعارہ ہے

ہر گھر کا دیا گل نہ کرو تم کہ نہ جانے
کس بام سے خورشید قیامت نکل آئے

یہاں خورشیدِ قیامت محبوب کا استعارہ ہے جو ایک الگ طرح کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

کبھی تو آنکھوں کے گلزاروں میں آکر ناچ
دل میں کون تجھے دیکھے گا اے جنگل کے مور

مور محبوب کے لیے ہر چند روایتی استعارہ ہے مگر بہت کم استعمال میں لایا گیا ہے۔ پھر فرازؔ نے جس سیاق وسباق میں اسے استعمال کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مَیں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے
اُداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

یہاں بھی آئینہ محبوب کے لیے استعمال ہوا ہے۔

تپتے صحراؤں پہ گرجا سرِ دریا برسا
تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برسا

ابر استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے

ہم بھی پتھر تھے مگر کیسا مقدر لائے
سب خدا ساز ملے کوئی صنم گر نہ ملا

صنم اردو شاعری کا پامال استعارہ ہے جس کو فراز نے نئے انداز میں پیش کیا ہے۔

آگ ہی آگ مرے قریۂ تن میں ہے فرازؔ
پھر بھی لگتا ہے ابھی سوزِ جنوں کچھ کم ہے

آگ بھی عشق کا ایک روایتی استعارہ ہے۔

دل نے ذرا سے غم کو قیامت بنا دیا
ورنہ وہ آنکھ اتنی زیادہ خفا نہ تھی

یہاں قیامت استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

یہاں پر چند اور استعاروں کے اشعار۔

مَیں بُت بنا اُسے دیکھا کیا تو اُس نے کہا
گزر چکی ہے بہت رات اب بجھا بھی دیا

☆

عشق ہے نام انتہاؤں کا
اس سمندر میں اعتدال کہاں

☆

مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
مَیں سنگِ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہوں

☆

رخصت ہوا وہ تو مَیں نے دیکھا
پھول اتنے بھی خوشنما نہیں تھے

☆

برہم بس اس خطا پہ امیرانِ شہر ہیں
ان جوہروں کو مَیں نے سمندر نہیں کہا

☆

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فرازؔ تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے

☆

جسم شعلہ ہے جبھی جامۂ سادہ پہنا
میرے سورج نے بھی بادل کا لبادہ پہنا

☆

خود اپنے خوں میں نہائے ہوئے مگر چپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سرخ پتھر کی

☆

آتش بجاں ہیں کب سے محبت میں ہم فرازؔ
اک بار جب لگی ہے تو پھر کب بجھی ہے آگ

☆

فرازؔ اپنی ادا کا ایک دیوانہ ہے کیا کیجیے
اُسے سارے مسیحاؤں میں اک قاتل پسند آیا

☆

خلوتی ہیں ترے جمال کے ہم
آئینے کی طرح سنبھال ہمیں

تشبیہ اور استعاروں کے مطالعہ کے بعد اب ہم فرازؔ کی شاعری میں روایتی اور نئی علامت کو دیکھیں۔ احمد فرازؔ نے اپنے کلام میں عمدہ علامتوں مثلاً چراغ، آگ، سمندر، سورج، وغیرہ کو نئے نئے مفاہیم میں استعمال کیا ہے۔ پاکستان میں فوجی حکومتوں کے عہد میں علامتی اظہار ویسے بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ فرازؔ اپنی علامتوں کے ذریعہ حکمرانوں پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے معاشرے کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتے ہیں، ایک خوش حال معاشرہ جس میں ہر چھوٹا بڑا انسان چین سکون سے کھلی فضا میں سانس لے سکے، اسی لیے انھوں نے اپنی علامتوں میں زیادہ تر حکمرانوں اور اہل سیاست کو نشانہ بنایا ہے

فرازؔ نے بہت سی روایتی علامتوں کو نئے انداز میں استعمال کیا ہے، جس سے ان کے عہد کی صورتِ حال نمایاں ہوتی ہے۔ چند علامتی اشعار درج ہیں:

بجھا کے طاق کی شمعیں نہ دیکھ تاروں کو
اسی جنوں میں تو برباد گھر ہمارے ہوئے

گھر کی شمعوں کو بجھا کے تاروں کو دیکھنا دانش مندی نہیں ہے، کیوں کہ اس طرح گھر برباد ہو جائے گا۔ پھر روشنی کی خواہش میں تاروں کو دیکھتے رہنا وہ خواہش ہے، جو کبھی پوری نہیں ہوگی

یہ اب جو آگ بنا شہر شہر پھیلا ہے
یہی دھواں مرے دیوار و در سے نکلا تھا

یہاں آگ اور دھواں دونوں ہی تباہی کی علامتوں کے طور پر مستعمل ہیں۔

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے
پیڑ گرتا ہے تو آجاتے ہیں آرے لے کر

اس شعر میں فراز نے پیڑ کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے جس میں معنی کی تہہ داری بدرجہ اتم موجود ہے، پیڑ کئی معنوں میں مستعمل ہے۔ ہر قاری اپنے تجربے کی بنا پر اس سے معنی نکال سکتا ہے۔

وہ ایک شخص کہ سورج کے روپ میں آیا
چرا کے لے گیا شمعیں فراز ہر گھر کی

اس شعر میں بھی وہی کیفیت ہے کہ سورج کو ہر قاری اپنے اپنے معنوں میں سمجھ سکتا ہے۔ واضح طور پر ایک معنی یہ سمجھ میں آتے ہیں کہ پاکستان کے فوجی حکمراں نے عوام کی زندگی کو درہم برہم کر دیا ہے۔

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پہ برستا دکھائی دے

یہاں صحرا، سمندر اور بادل علامتی مفاہیم ظاہر کر رہے ہیں۔

یہ کیسی زہر بھری بارشیں ہوئیں اب کے
کہ میرے سارے گلابوں کا رنگ نیلا ہے

آج کی سیاسی صورتِ حال کا یہ شعر آئینہ ہے، جس میں تباہی کی بہت سی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔

سورج کی روشنی پہ جنھیں ناز تھا فراز
وہ بھی تو زیرِ سایۂ دیوار آ گئے

عروج کے وقت ہر کوئی ساتھ ہوتا ہے، جب زوال، مصیبتیں آتی ہیں تو انھیں بھی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

کون طاقوں پہ رہا کون سرِ راہ گزر
شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی ہے

یہ بھی ایک سیاسی پس منظر کا علامتی اظہار ہے۔

تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ مَیں پیاس کا دامن کھولوں

اس شعر میں فرازؔ نے جہاں ایک طرف سماج کے بڑے لوگوں کی جانب اشارہ کیا ہے وہیں اپنی مجبوریوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

ہوا نہ دو کہ یہ جنگل کی آگ ہے یارو
عجب نہیں ہے اگر پھیل جائے شہروں میں

سیاست داں کسی جنگل کی آگ سے کم نہیں ہوتے اور اگر ان کی باتوں کو ہوا دو گے تو شہر بھر میں آگ پھیل جائے گی۔

اے سمندر کی ہوا تیرا کرم بھی معلوم
پیاس ساحل کی تو بجھتی نہیں سیلاب سے بھی

سیلاب کے آنے سے ساحل کی پیاس بجھتی نہیں، بلکہ ساحل اپنا وجود ہی کھو دیتا ہے اسی طرح سماج میں بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سمندر کی طرح ظاہری طور پر پیاس بجھاتے ہیں، مگر جو کسی سیلاب کی طرح شہر کا شہر، گاؤں کا گاؤں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

ہم کج ادا چراغ کہ جب بھی ہوا چلی
طاقوں کو چھوڑ کر سرِ دیوار آگئے

کج ادا چراغ جس کی ہوا سے دشمنی ہے اور دشمنی کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ ایسے میں جب بھی ہوا چلی ہے تو اہل دل گھروں کو چھوڑ کر بازار میں آگئے ہیں۔ تاکہ ہوا کا سامنا کریں۔

کچھ درخت ایسے بھی فصلِ گل میں تھے جن پر
زرد زرد پتے تھے خشک چھا لیں تھیں

اب کے فصلِ گل میں غریبی، مفلسی، تنگ دستی اور مجبوریاں بھی پھیل گئی تھیں۔

کچھ اور شعر علامتی پیرائے کے

وہ وقت آگیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندروں میں اتر جانا چاہیے

☆

بتا رہا ہے فضا کا اٹوٹ سناٹا
افق سے پھر کوئی آندھی اترنے والی ہے

☆

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پہ برستا دکھائی دے

☆

اس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

☆

چراغِ جاں کو کہاں تک بچا کے ہم رکھتے
ہَوا بھی تیز تھی، منزل بھی چل چلاؤ کی تھی

محاکات کو کچھ نقادوں نے شاعری کا اصل عنصر قرار دیا ہے اور بعض نے پیکر تراشی کو اہمیت دی ہے۔ شبلی نے محاکات کو اہمیت دی ہے ان کا خیال ہے کہ محاکات کے ذریعہ شاعر کسی بھی مادی شئے اور انسانی جذبات کی عکاسی پر قدرت حاصل کرلیتا ہے اور وہ کسی بھی خیال کسی بھی کیفیت کو بڑی آسانی سے لفظوں میں پیش کرسکتا ہے۔

احمد فراز نے جہاں اپنے تخیل کے اظہار کے لئے تشبیہ، استعارہ، علامت اور پیکر تراشی کا سہارا لیا ہے وہیں پر انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے محاکات کا بھی سہارا لیا ہے۔ ان کے کلام میں محاکات کے بھی اشعار موجود ہیں۔

فراز کے محاکات میں دل کشی پائی جاتی ہے وہ کسی بھی منظر کی منظر کشی دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے شعر پڑھتے ہی ذہن میں پوری تصویر ابھر جاتی ہے۔ احمد فراز کی شاعری سے محاکات کی کچھ مثالیں درج ہیں:

پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
مَیں ڈوبتا ہوا دریا کے پار اتر بھی گیا

☆

یا یہ شعر

دلوں سے وہ گزر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا

☆

ایک اور شعر

اترا بھی تو کب درد کا چڑھتا ہوا دریا
جب کشتیِ جاں موت کے ساحل سے لگی تھی

☆

یہ بھی شعر

سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

ایک اور شعر

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فراز تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے

ایک اور شعر

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اڑتے ہوئے اوراق پریشاں جاناں

☆

یہ بھی شعر

اتنا سناٹا کہ جیسے ہو سکوتِ صحرا
ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دہائی دی ہے

☆

ایک اور شعر

کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے

ان اشعار میں لفظوں کی مدد سے جو تصویریں بنائی گئی ہیں وہ آرٹ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں اور محاکات کی عمدہ مثالیں۔

اردو میں پیکر تراشی کے ضمن میں ناصر کاظمی کا نام سرِ فہرست ہے۔ بلکہ ان کے بعد ایک خلا دکھائی دیتا ہے تاہم بعض شعراء کے یہاں پیکر تراشی کے کچھ نمونے بہر حال مل جاتے ہیں۔ احمد فرازؔ کے یہاں بھی پیکر تراشی کی کچھ مثالیں ملتی ہیں مثلاً

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی مَیں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

☆

سناٹے کی جھیل میں تو نے
پھر کیوں پتھر پھینک دیا ہے

☆

خیال یار کا بادل اگر کھلا بھی کبھی
تو دھوپ پھیل گئی جابجا اداسی کی

☆

آنکھ بھی برسی بہت بادل کے ساتھ
اب کے ساون کی جھڑی اچھی لگی

پیکر تراشی کی ان چند مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ فراز بھی اس فن پر اچھی گرفت رکھتے تھے

اب آیئے فراز کی غزلوں میں چند دیگر صنعتوں کا جائزہ لیں۔

تلمیح کی چند مثالیں

ہم خلد سے نکل تو گئے ہیں پر اے خدا
اتنے سے واقعے کا فسانہ بہت ہوا

☆

گوتم کی طرح رشی نہیں تھا
لیکن نکلا ہوں تج کے گھر مَیں

☆

مثال دست زلیخا تپاک چاہتا ہے
یہ دل بھی دامن یوسف ہے چاک چاہتا ہے

☆

اب زمیں پر کوئی گوتم نہ محمد نہ مسیح
آسمانوں سے نئے لوگ اتارے جائیں

☆

عیسٰی نہ بن کہ اس کا مقدر صلیب ہے
انجیل آگہی کے ورق عمر بھر نہ کھول

مراعاۃ النظیر کی چند مثالیں۔ درج اشعار میں خط کشیدہ الفاظ میں ایسی اشیاء کا ذکر ہے جن میں تضاد کے علاوہ مناسبت موجود ہے

ترسی ہوئی آنکھوں میں کن کن ساحلوں کے خواب تھے
پر کشتی عمر رواں حالات کی دلدل میں تھی

☆

یہ مرا حسن نظر ہے تو دکھادے کوئی
قامت و گیسو و رخسار و دہن تم جیسے

☆

ہم بھی پتھر تھے مگر کیسا مقدر لائے
سب خدا ساز ملے کوئی صنم گر نہ ملا

☆

جب شہر کھنڈر بن جائے
پھر کس پر سنگ اٹھاؤ گے

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے؟
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

☆

ایسا لگتا ہے کہ ہر موسم ہجراں میں بہار
ہونٹ رکھ دیتی ہے شاخوں پہ تمہارے لے کر

☆

صنعت تضاد کی چند مثالیں۔ خط کشیدہ الفاظ صنعت تضاد کو ظاہر کرتے ہیں

وصل ہو ، ہجر ہو ، قربت ہو کہ دوری ہو فرازؔ
ساری کیفیتیں سب تشنگیاں ایک سی ہوں

☆

تم نے اک سنگ اُٹھایا مرے آئینے پر
اور ہر شخص کو مَیں آئینہ گر کر آیا

☆

تیرے قریب آکے بڑی اُلجھنوں میں ہوں
مَیں دشمنوں میں ہوں کہ ترے دوستوں میں ہوں

☆

شب سلگتی ہے دوپہر کی طرح
چاند ، سورج سے جل بجھا جیسے

☆

بہار آنے تلک پیڑوں کی صورت
چلو ہم بھی خزاں کے رنگ پہنیں

صنعت فوق النقاط۔جس میں نقطے الفاظ کے اوپر آتے ہیں مثلاً

ادھر اک دل ادھر ساری خدائی
دہائی ہے خداوند دہائی

صنعت تحت النقاط۔جس میں تمام کے تمام نقطے الفاظ کے نیچے آتے ہیں مثلاً

اک ہجر کا روگ عمر بھر کا
اک عمر کہ ہے ادھار جیسی

صنعت ارشاد وہ صنعت ہے جس میں شعر کے ختم ہونے سے پہلے قافیہ معلوم ہوجاتا ہے اس کا استعمال عموماً مطلعے میں کیا جاتا ہے۔احمد فرازؔ کے یہاں اس طرح کے کئی شعر موجود ہیں مثلاً

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

☆

آنکھ سے دور نہ ہو دل سے اتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزرجائے گا

☆

کیوں نہ ہم عہد رفاقت کو بھلانے لگ جائیں
شاید اس زخم کو بھرنے میں زمانے لگ جائیں

☆

مگر یہ دردِ طلب بھی سراب ہی نکلا
وفا کی لہر بھی جذبات کے بہاؤ کی تھی

☆

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہوگئے
پھر جو بھی در ملا اُسی در کے ہوگئے

☆

تجھ سے بچھڑ کر زندہ تھا
مرمر کر یہ زہر پیا تھا

☆

ہر دوا درد کو بڑھا ہی دے
اب تو اے دل اُسے بھلا ہی دے

☆

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

☆

ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں
فرازؔ اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں

ان سبھی اشعار کو پڑھتے ہی ہمیں اس کے قافیہ معلوم ہو جاتے ہیں جسے صنعت ارشاد کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حسن تعلیل کے اشعار

بھری بہار میں اک شاخ پر کھلا ہے گلاب
کہ جیسے تو نے ہتھیلی پہ گال رکھا ہے

☆

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اک بوند
دل میں اک لہر اٹھی آنکھ سے دریا برسا

☆

چیخ اٹھا ہوں سلگتی چٹان کی صورت
پکار اب تو مرے دیر آشنا مجھ کو

☆

سو دیکھ کر ترے رخسار و لب یقین آیا
کہ پھول کھلتے ہیں گلزار کے علاوہ بھی

☆

شہرِ دل میں تو سدا بھیڑ لگی رہتی ہے
پر ترے واسطے اے جانِ من آ، راستہ ہے

احمد فرازؔ اپنے عہد کی تمام عصری صورتِ حال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فرازؔ اور فیضؔ کے نظریے میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے، اعلیٰ اقدار حیات کی بے حرمتی کے خلاف فیضؔ نے اپنی آواز بلند کی تھی

اوران کے بعد اس کے خلاف سب سے بلند آواز فرازؔ ہی کی سنائی دیتی ہے یہی آواز اس بات کی دلیل ہے کہ فرازؔ صرف ایک سچے عاشق ہی نہیں، بلکہ ایک سچے انقلابی بھی تھے یہ الگ بات ہے کہ فرازؔ نے نعرہ بازی نہیں کی اور یہی وجہ ہے ان کی آواز رومانیت پسندوں اور انقلابیوں دونوں کو متاثر کرتی ہے جہاں فرازؔ اپنے شہر کا ماتم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں محبت بھی ؛ ماتم فوجی حکمرانوں کا اور محبت وہ انسانیت سے کرتے ہیں۔

فرازؔ نے اپنے عہد کی منافقت اور ریاکاری کو جگہ جگہ بے نقاب کیا ہے اور اسی وجہ سے پاکستان میں فوجی حکومت (مارشل لاء) میں ان کو بہت اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیوں کہ فراز جمہوری طرزِ حکومت کے حامی تھے۔ جس کی بازگشت ان کی پوری شاعری میں سنائی دیتی ہے۔

فرازؔ کی نظموں کو اگر ان کے عہد کا آئینہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا بلکہ بجا ہوگا۔ جس میں انھوں نے اپنے عہد کی سچائیوں کو جذب کر دیا ہے، ان کی نظم "محاصرہ" "شہر آشوب" "نئی مسافت کا عہد" "جانشین" "قلم سرخرو ہے" "مت قتل کرو آوازوں کو" "ابو جہاد" "اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں" "ندیم آنکھیں" "ندیم چہرہ" "چلو اس شہر کا ماتم کریں" "حرف کی شہادت" "شہر کا سورج" "دوسری ہجرت" "اب کس کا جشن مناتے ہو" "شہر نامہ" وغیرہ اپنی عصری صورت حال کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔

"احمد فرازؔ کہتے ہیں کہ اس دورِ ستم میں شاعر و تخلیق کار اور تمام اہل علم کو فن کی حرمت اور قلم کی آبرو بچانے کی جدو جہد کرنی ہے۔ فن اور قلم انسانی نسل کی امانت ہیں آزادی فکر و نظر اور آگہی کا ورثہ نئی نسل تک پہچانا ان کی ذمہ داری ہے۔" جس کا اشارہ انھوں نے اپنی نظم "محاصرہ" میں کچھ اس طرح کیا ہے:

میرا قلم تو امانت میرے لہو کی ہے
میرا قلم تو امانت میرے ضمیر کی ہے

حکومت کی طرف اشارہ کیا ہے:

سو یہ جواب ہے میرا میرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرص کرم ہے نہ خوف خمیازہ
اسے ہے سطوت شمشیر پر گھمنڈ بہت
اسے شکوہ قلم کا نہیں ہے اندازہ

میرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
میرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
میرا قلم تو امانت میرے ضمیر کی ہے
اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے

یہ وہی نظم ہے جس کو ضیاء الحق کے دور میں فرازؔ نے ایک مشاعرہ میں پڑھا تھا اور جس کے بعد انھیں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ بعد میں فرازؔ کو جلاوطنی بھی اختیار کرنی پڑی تھی۔

فرازؔ کی ایک اور نظم "قلم سرخرو ہے" کے کچھ حصے درج ہیں جس میں عصری صورت حال کی تصویر جھلکتی ہے:

قلم سرخرو ہے
کہ اس نے لکھا تھا

وہ بازو
جو پتھر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں ان کے گھر
بے کفن ان کی لاشیں
وہی کوہکن
جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
مگر خسروانِ جہاں ان کی شیریں چرالیں
وہی جن کے جسموں کے پیوند
اہل ہوس کی قبا میں لگے تھے
وہی سادہ دل

جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں

تو لب منعموں کی ثنا میں لگے تھے
اب ان کی ثنا چار سو ہے
قلم سرخرو ہے

یہ نظم اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ فرازؔ نے اس کے ذریعے اپنے دور کی تصویر پیش کی ہے، اگر چہ بات فرازؔ ماضی کے حوالے سے کرتے ہیں، لیکن اس نظم کی عصری معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

فراز کی نظم پچھلا پہر:

نہ کہیں شہرِ مہرباں کی ہوا
نہ کوئی یارِ ہمدم و دمساز
نہ سرِ بام زلفِ آوارہ
نہ سرِ راہ چشمِ فتنہ طراز
نہ کہیں کوئے چاک داماناں
نہ کہیں روئے دوستانِ فراز
نہ کوئی بیتِ بیدل و غالب
نہ کوئی شعرِ حافظِ شیراز
نہ کوئی شمعِ کشتہء شب ہے
نہ کوئی عندلیب سینہ گداز
خلوتِ غم نہ بزمِ رسوائی
نہ سوالِ طلب نہ عرضِ نیاز
چار سو اک فصیل بے در ہے
چار جانب حصارِ بے انداز
نیند کے طائرانِ بے پروا

شاخِ مژگاں سے کر گئے پرواز
ایسی ویرانیوں سے گھبرا کر
جب اٹھاتا ہوں تیری یاد کا ساز
توڑ دیتی ہے سلسلے سارے
پہرہ داروں کی بدنما آواز

یہ نظم مانسہرہ کیمپ کی قید تنہائی (۱۹۷۷ء) کی یادگار ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کے فرازؔ نے ان دنوں کس کس طرح کی اذیتیں جھیلی تھیں

قیدِ تنہائی کے اسی کرب کی ترجمانی ان کی ایک اور نظم میں ملتی ہے:

اتنا سناٹا کہ جیسے ہو سکوتِ صحرا
ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دہائی دی ہے
جانے زنداں سے ادھر کونسے منظر ہوں گے
مجھ کو دیوار ہی دیوار دکھائی دی ہے
دور اک فاختہ بولی ہے بہت دور کہیں
پہلی آواز محبت کی سنائی دی ہے

(نظم پہلی آواز)

فرازؔ کی اس نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محبت کا کتنا بھوکا انسان ہے۔ جو دنیا میں محبت کو عام کرنا چاہتا ہے۔ مگر زمانے نے اسے قید کر رکھا ہے

ان کی ایک اور نظم آشیاں گم کردہ:

عجب منظر سوادِ شام کی آنکھوں میں پھرتے ہیں
ہوا سورج کی مشعل کو جلاتی ہے بجھاتی ہے
افق پر کتنی تصویریں ابھرتی ہیں بکھرتی ہیں
شفق میں آشنا چہروں کی رنگت پھیل جاتی ہے

تو دامان نظر میں بے محابا پھول کھلتے ہیں
تو جیسے جوئبار یاد یاراں گنگناتی ہے
وہ ہمدم مجھ کو حیراں و پریشاں ڈھونڈتے ہوں گے
کہ جن کی مہرباں آنکھوں میں شبنم جھلملاتی ہے
قفس میں روزن دیوار و زخم در نہیں لیکن
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے

اس نظم میں بھی فرازؔ نے قید تنہائی میں رہ کر اپنے احساسات کو قلم بند کیا ہے، تاہم قابل غور بات یہ ہے کہ ان اشعار سے کسی طرح کی مایوسی کا اظہار نہیں ہوتا، فرازؔ کی نظر ہمیشہ اپنی منزل پر رہتی ہے

قیدِ تنہائی کی ہی کے تعلق سے ان کی ایک اور نظم ملاحظہ کیجئے:

دل قفس میں بھی غزل خواں ہیں بیاد جاناں
غم جاں بھی غم جاناں ہے بیاد جاناں
کب رگ و پے میں نہ تھا درد کا قاتل نشتر
آج پیوست رگ جاں ہے بیاد جاناں
یوں صبا آتی ہے گلگشت کو، جیسے زنداں
کوچہ چاک گریباں ہے بیادِ جاناں

(نظم بیادِ جاناں)

فرازؔ کے دو مجموعے ''بے آواز گلی کوچوں میں'' اور ''پس انداز موسم'' اپنی عصری صورت حال کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں، کیوں کہ زیادہ تر نظمیں، غزلیں، قید تنہائی اور پاکستان کی عصری صورت حال کی ترجمان ہیں۔

فرازؔ کی نظم ''شہر نامہ'' جو ایک طویل نظم ہے بہ ظاہر او جڑی کیمپ کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ لیکن جوں جوں شاعر آگے بڑھتا ہے یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے ملک کی حدود سے باہر نکلتے ہوئے اپنے عصر کا سارا منظرنامہ بیان کرتا جارہا ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

مری عدل گاہوں کی مصلحت
مرے قاتلوں کی وکیل ہے
مرے خانقاہوں کی منزلت
مری بزدلی کی دلیل ہے
مرے اہل حرف و سخن سرا
جو گداگروں میں بدل گئے
مرے ہم سفیر تھے حیلہ جو
کسی اور سمت نکل گئے
کئی فاختاؤں کی چال میں
مجھے کر گسوں کا چلن لگا
کئی چاند بھی تھے سیاہ رُو
کئی سورجوں کو گہن لگا
کوئی تاجر حسب و نسب
کوئی دیں فروشِ قدیم ہے
یہاں کفش بر بھی امام ہیں
یہاں نعت خواں بھی کلیم ہیں
کوئی فکر مند کلاہ کا
کوئی دعویٰ دار قبا کا ہے
وہی اہلِ دل بھی ہیں زیب تن
جو لباس اہلِ ریا کا ہے
مرے پاسباں مرے نقب زن
مرا ملک ملکِ یتیم ہے

مرا دیس میر سپاہ کا
مرا شہر مالِ غنیم ہے
جو روش ہے صاحبِ تخت کی
سو مصاحبوں کا طریق ہے
یہاں کوتوال بھی دزدِ شب
یہاں شیخ دیں بھی فریق ہے
یہاں سب کے نرخ جدا جدا
اسے مول لو اسے تول دو
جو طلب کرے کوئی خوں بہا
تو دہن خزانے کا کھول دو
جو سرکشی کا ہو مرتکب
اسے قینچیوں سے زبوں کرو
جہاں خلق شہر ہو مشتعل
اسے گولیوں سے نگوں کرو
اسی عرصۂ شب تار میں
یوں ہی ایک عمر گزر گئی
کبھی روزِ وصل بھی دیکھتے
یہ جو آرزو تھی وہ مر گئی
یہاں روزِ حشر بپا ہوئے
پہ کوئی بھی روزِ جزا نہیں
یہاں زندگی بھی عذاب ہے
یہاں موت میں بھی شفا نہیں

شاعر اپنے ہم نواؤں سے پوچھتا ہے کہ انھوں نے کس لیے اپنے قلم کی ناموس کو فروخت کیا ملاحظہ ہو:

سقراط و مسیح کے فسانے
تم بھی تو بہت سنا رہے تھے
منصور و حسینؑ سے عقیدت
تم بھی تو بہت جتا رہے تھے
کہتے تھے صداقتیں امر ہیں
اوروں کو یہی بتا رہے تھے
اور اب جو ہیں جابجا صلیبیں
تم بانسریاں بجا رہے ہو
اور اب جو ہے کربلا کا نقشہ
تم مدح یزید گا رہے ہو
جب سچ تہہ تیغ ہو رہا ہے
تم سچ سے نظر چرا رہے ہو
جی چاہتا ہے کہ تم سے پوچھوں
کیا راز اس اجتناب میں ہے
تم اتنے کٹھور تو نہیں تھے
یہ بے حسی کس حساب میں ہے
تم چپ ہو تو کس طرح سے چپ ہو
جب خلق خدا عذاب میں ہے
سوچو تو تمھیں ملا بھی کیا ہے
اک لقمہ تر قلم کی قیمت

غیرت کو فروخت کرنے والو
اک کاسۂ زر قلم کی قیمت
پندار کے تاجرو بتاؤ
دربان کا در قلم کی قیمت
ناداں تو نہیں ہو تم کہ سمجھوں
غفلت سے یہ زہر گھولتے ہو
تھامے ہوئے مصلحت کی میزان
ہر شعر کا وزن تولتے ہو
ایسے میں سکوت، چشم پوشی
ایسا ہے کہ جھوٹ بولتے ہو
اک عمر سے عدل و صدق کی لاش
غاصب کی صلیب پر جڑی ہے
اس وقت بھی تم غزل سرا ہو
جب ظلم کی ہر گھڑی کڑی ہے
جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

اور پھر نظم کے آخر میں یوں گویا ہوتے ہیں:

اے حیلہ گرانِ شہر شیریں
آیا ہوں پہاڑ کاٹ کر میں
ہے بے وطنی گواہ میری
ہر چند پھرا ہوں دربدر میں
بیچا نہ غرورِ بے نیازی

ایسا بھی نہ تھا سبک ہنر میں
تم بھی کبھی ہم نوا تھے میرے
پھر آج تمھیں یہ کیا ہوا ہے
مٹی کے وقار کو نہ بیچو

یہ عہد ستم، جہاد کا ہے
دریوزہ گری کے مقبروں سے
زنداں کی فصیل خوش نما ہے
کب ایک ہی رت رہی ہمیشہ
یہ ظلم کی فصل بھی کٹے گی
جب حرف کہے گا قُم بِاِذنی
مرتی ہوئی خاک جی اٹھے گی
لیلائے وطن کے پیرہن میں
بارود کی بو نہیں رہے گی
پھر باندھیں گے ابروؤں کے دوہے
پھر مدح رخ و دہن کہیں گے
ٹھہرائیں گے ان لبوں کو مطلع
جاناں کے لیے سخن کہیں گے
افسانۂ یار و قصۂ دل
پھر انجمن انجمن کہیں گے

اگرچہ یہ نظم پاکستان کی صورت حال کا نوحہ ہے لیکن یہ بند ان ہاتھوں کی نشاندہی کرتی ہے جو اس عذاب کا باعث بنے تھے۔

پاکستان میں ادیبوں اور شاعروں کو سکون کے ساتھ کبھی آزادی حاصل نہیں۔ ہر دور کے

دانشوروں کو سچ کہنے کے لیے شدید مشکلات سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ فرازؔ نے بھی کئی مشکلات کا سامنا کیا۔ بلکہ سچ بولنے کی وجہ سے انھیں جلاوطنی تک اختیار کرنی پڑی ۔مگر فرازؔ سچ بولنے سے کبھی باز نہیں آئے۔

۱۹۷۷ء۔ ۱۹۸۸ء کی صورت حال کی عکاسی فرازؔ نے مندرجہ ذیل دو اشعار میں کچھ اس طرح سے بیان کی ہے۔

آنکھیں کہیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
اور زخم جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں پاتا

*

دیکھو پندار ان آشفتہ سروں کا نہ جنھیں
بخت منصور ملا تخت سکندر نہ ملا

ان دو اشعار میں فرازؔ نے اس دور حکومت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بے رحمانہ قتل نے فرازؔ کو جذباتی طور پر بہت متاثر کیا تھا کیوں کہ انھیں بھٹو سے بڑی عقیدت تھی۔ بھٹو پر انھوں نے نظمیں لکھی ہیں اور ان کی غزلوں میں تو انکی شہادت ایک مستقل استعارہ بن گئی ہے۔ کہیں کہیں فراز براہ راست مخاطب ہو کر کہتے تھے

تیرا بچھڑنا جان غزل
شہر غزل کا مقطع ہے

فراز کی ایک اور نظم "جلاد سے" ان نظموں میں سے ہے جن میں وہ بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ جلاد سے پوچھتے ہیں کہ تو کہاں سوچتا ہے کہ جس کو تو دار پر چڑھا رہا ہے وہ گناہگار ہے بھی یا نہیں؟ کیا ان میں کوئی ایسا بھی سزا یافتہ ہوتا ہے کہ جس سے سولی اپنے عمل سے شرما جاتی ہو؟ اور ان میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جن سے تختہ دار سجا سجا سا لگتا ہوگا۔ فراز نے اس نظم کے آخری شعر کو میر کے مصرع پر تضمین کیا ہے:

نام ہے کس کا دام ہے کس کا اور یہاں صیاد ہے کون
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

فراز کی ایک اور نظم 'اے دیس سے آنے والے بتا'' میں ان کی جلاوطنی کا کرب بڑے فن کارانہ انداز میں بیان ہوا ہے۔ وہ اُس وقت بلوماؤنٹ لیک (نیویارک) میں تھے۔

وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے اب اس کا نظارہ کیسا ہے
ہر دشمن جاں کس حال میں ہیں ہر جان سے پیارا کیسا ہے
شب بزم حریفاں جمتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں
یاروں کی بسر اوقات ہے کیا ہر انجمن آرا کیسا ہے
کیا کوئے نگاراں میں اب بھی عشاق کا میلہ لگتا ہے
اہل دل نے قاتل کے لیے مقتل کو سنوارا کیسا ہے
کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگرو ہیں ہوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں اب وقت کا دھارا کیسا ہے
قاصد کے لبوں پر کیا اب بھی آتا ہے ہمارا نام کبھی
وہ بھی تو خبر رکھتا ہوگا یہ جھگڑا سارا کیسا ہے
جب بھی میخانے بند ہی تھے اور وا درِ زنداں رہتا تھا
اب مفتئ دیں کیا کہتا ہے موسم کا اشارہ کیسا ہے
میخواروں کا پندار گیا اور ساقی کا معیار گیا
کل تلخی مے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے
ہر ایک کشیدہ قامت پر کیا اب بھی کمندیں پڑتی ہے
جب سے وہ میحا دار ہوا ہر درد کا مارا کیسا ہے
کہتے ہیں کہ گھر اب زنداں ہیں سنتے ہیں کہ زنداں مقتل ہیں
یہ جبر خدا کے نام پہ ہے یہ ظلم خدارا کیسا ہے
یہ شام ستم کٹتی ہی نہیں یہ ظلمتِ شب گھٹتی ہی نہیں
میرے بدقسمت لوگوں کی قسمت کا ستارا کیسا ہے

پندار سلامت ہے کہ نہیں بس یہ دیکھو یہ مت دیکھو
جاں کتنی ریزہ ریزہ ہے دل پارا پارا کیسا ہے

☼ ☼ ☼ ☼ ☼

اس نظم کا ایک ایک مصرعے سے ایک ایسے حب الوطن کا کرب جھلک رہا ہے جو اپنے وطن کی نظامِ حکومت کا شکار ہوا ہے۔

فراز کی نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی عصری صورتِ حال کی عکاسی ملتی ہے۔ جس میں کہیں ملک سے دور رہنے کا دکھ، تو کہیں اپنے دوستوں سے بچھڑنے کا غم، تو کہیں اپنی دربدری کے کرب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ درج ذیل اشعار کو پاکستان کے سیاسی تناظر میں دیکھئے۔

تھی افق تابہ افق یوں تو مری خاک فراز
کس قدر تنگ مگر مجھ پہ وطن میرا تھا

☆

ہماری دربدری کا یہ ماجرا ہے کہ ہم
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

☆

کسی اور دیس کی اور کو، سنا ہے فراز چلا گیا
سبھی دکھ سمیٹ کے شہر کے، سبھی قرض اتار کے شہر کا

☆

اکیلے پن کی اذیت کا اب گلہ کیسا
فراز خود ہی تو اپنوں سے ہوگئے تھے الگ

☆

یہ بھی کیا کم ہے غریب الوطنی میں کہ فراز
ہم کو بے مہریٔ اربابِ وطن یاد نہیں

☆

اے بے وطنی گواہ رہنا
ہر چند پھرا ہوں دربدر میں

☆

مری زمیں پستیوں سے مجھ کو پکارتی ہے
کوئی بشارت مرے خدا اب زوال کی ہو

☆

شہر یاروں کے بلاوے بہت آتے ہیں فراز
یہ نہ ہو آپ بھی دربار میں گم ہو جائیں

☆

ہمیں بھی اپنے کئی دوست یاد آتے ہیں
کبھی جو بات چلے ناسپاس لوگوں کی

☆

اب کے ہم پر یہ کیسا سال پڑا لوگو
شہر میں آوازوں کا کال پڑا لوگو

فرازؔ نے انسان کی تذلیل اور بے حرمتی کے خلاف ہمیشہ اپنی آواز کو بلند کیا ہے۔ اُنھوں نے کبھی آمریت کی تیز دھوپ میں جمہوریت کے خواب کو پگھلنے نہیں دیا۔ بلکہ بہت سی اذیتیں اُٹھائیں مگر اپنی آواز کا گلا نہیں گھونٹا، وہ کہتے ہیں۔

کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو
ہم لوگ نوا گر ہیں ہمیں اذنِ نوا دو

اس شعر سے متعلق طاہر محمد خان فرماتے ہیں:

"ایک قبیلہ ہر وقت ایسا رہا ہے جس نے حق کا ساتھ دیا ہے وہ درباروں سے دور رہے،

خلعت کی طلب میں دست طلب نہیں بڑھایا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کو سزا ہوئی اسی ہفتے ضیاالحق نے اکادمی ادبیات کے نام سے دانشوروں اور قلمی نوکروں کو جمع کیا۔ بے شک ہزاروں موجود تھے لیکن ہزاروں نے جانے سے انکار بھی کر دیا تھا۔ ضیاء الحق نے ان کو بتایا کہ اس نے قبلہ درست کرنے کے لیے انھیں بلایا ہے لیکن ابھی ان کی قبر کی مٹی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ یہی لوگ بے نظیر کے دربار میں گئے اور پھر نواز شریف سے بھی رسم و راہ بڑھائی فراز نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔"[1]

فراز نے اس شعر میں ضیاء الحق کی طرف اشارہ کیا ہے ہم نے کب یہ کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو، حکومت کے ہم لوگ تو خدمت گزار ہیں ہمیں حاکم کے تاج کی ضرورت نہیں، بلکہ انسانی اقدار کی حفاظت چاہیے۔

طاہر محمد خاں فرماتے ہیں:

"فراز ہمارے دور کے ان شاعروں میں سے تھے جنھوں نے خلق خدا کے درد کو اپنا درد سمجھا ہے وہ اپنی حاجات کے لیے پریشان نہیں، اس کی پریشانی اس کے اردگرد پھیلے ہوئے انسان کی حالت زار سے ہے۔"[2]

فراز کی شاعری میں عصری مسائل کی عکاسی بدرجہ اتم موجود ہے، دنیا میں اُسی ادب کو آفاقی ادب کا درجہ ملا ہے جس میں تفکر اور عصری آگہی پائی گئی ہے اور ظاہر ہے ایسا تبھی ہو سکتا ہے جب شاعر کا دل اپنے لیے نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے لیے دھڑکتا ہو۔ فراز کی شاعری ان خوبیوں سے مزین ہے۔

فراز جب نظموں کے دائرے سے نکل کر غزلوں کی طرف بڑھتے ہیں تو غزل کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس کے ناز خوب اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں کے حوالے سے دنیا میں پیار و محبت کے درس کو عام کیا اور اپنے اردگرد کے ماحول سے محبت کی ہے، انسانی رشتوں کا احترام کیا عشق کے شعلے کو اپنے دل میں ہمیشہ جوان رکھا۔ ان کی شاعری میں وصال سے زیادہ ہجر کے کرب کا احساس ملتا ہے۔ چنانچہ فراز نے اس کے حوالے سے انسانی زندگی کو پیار و محبت کا پیغام دیا ہے، عشق کو زندگی کی کامیابی کا ضامن قرار دیا ہے اور عشق و

محبت ہی کو زندگی کا سب سے اہم اثاثہ قرار دیا ہے۔ فراز کا ماننا تھا کہ محبت کے بغیر زندگی کے فلسفہ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اسی لئے اُنھوں نے عشق کے تصور کو وہ معنویت دی جس کی اردو شاعری بھی امین تھی۔ اُن کا خیال تھا ”جو عشق نہیں کر سکتا وہ اس دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا ہے۔“

لٹ چکے عشق میں اک بار تو پھر عشق کرو
کس کو معلوم کہ تقدیر سنور بھی جائے

☆

اے خدا آج اسے سب کا مقدر کر دے
وہ محبت کہ جو انساں کو پیمبر کر دے

☆

نووار دان مدرسہ عشق کے لیے
درس وفا کا قاعدہ آساں ضرور ہو

☆

کہاں کے مکتب و ملا کہاں کے درس و نصاب
بس اک کتاب محبت رہی ہے بستے میں

☆

محبت اپنا اپنا تجربہ ہے
یہاں فرہاد و مجنوں معتبر نہیں

☆

حوصلہ چاہیے طوفان محبت میں فراز
اس سمندر میں تو بس موج فنا راستہ ہے

☆

میں اس کو دیکھتا رہتا تھا حیرتوں سے فراز
یہ زندگی سے تعارف کی ابتدا تھی مری

☆

ابھی ابھی تو جدائی کی شام آئی تھی
ہمیں عجیب لگا زندگی کا ڈھل جانا

✵ ✵ ✵ ✵ ✵

جہاں فرازؔ نے محبت کو زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیا ہے اور اس کے درس کو عام کیا ہے وہیں اُنھوں نے انسانی رشتوں کو نبھانے کی اعلیٰ ترین مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ وہ اپنوں سے خندہ پیشانی سے ملنے کی بات کرتے ہیں تو دشمنوں کو گلے بھی لگاتے ہیں۔ مثلاً

وہ مروت سے ملا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

☆

ستم گری کا ہر انداز محرمانہ لگا
میں کیا کروں مرا دشمن مجھے برا نہ لگا

☆

میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے

☆

عمر بھر کون نبھاتا ہے تعلق اتنا
اے مری جان کے دشمن تجھے اللہ رکھے

☆

آج دشمن کی موت کا سن کر
یوں لگا میں بھی مر گیا کچھ کچھ

☆

آ گلے تجھ کو لگا لوں میرے پیارے دشمن
اک مری بات نہیں تجھ پہ بھی کیا کیا گزری

☆

دعائیں دو مرے قاتل کو تم کہ شہر کا شہر
اسی کے ہاتھ سے ہونا ہلاک چاہتا ہے

☆

فراز کے ان اشعار سے یہی واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانی رشتوں کی بڑی حد تک قدر کی ہے دوستی کو اہمیت دیتے ہوئے دشمن کو بھی گلے لگانے کی بات کی ہے۔ بالفاظ دیگر فراز نے زندگی کے ہر ایک رشتے میں محبت کے درس کو عام کیا ہے، ترکِ تعلق کو فرازؔ نے کسی عذاب سے کم نہیں سمجھا وہ فرماتے ہیں:

کانپ اٹھے فراز دونوں عالم
جب سازِ وفا کے تار ٹوٹے

☆

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترک محبت کرنے والو! تم تنہا رہ جاؤ گے

☆

مجھ سے بچھڑ کے تو بھی روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں

☆

آج تو اے دل ترک تعلق پر تم خوش ہو
کل کے پچھتاوے کو بھی امکان میں رکھنا

جہاں فرازؔ نے عشق ومحبت کو زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ تسلیم کیا ہے وہیں انھوں نے زندگی کو خدا پاک کا انسانوں کے لیے ایک عظیم انمول تحفہ قرار دیا، وہ زندگی کی تمام حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔اسی

لیے وہ زندگی کو زندہ دلی کے ساتھ جینے کا درس دیتے ہیں، اس حقیقت کو جانتے ہوئے کہ یہ زندگی کسی خواب سے زیادہ نہیں مگر ان سب کے باوجود وہ زندگی سے محبت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

☆

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اتر جائے گا

☆

ابھی ابھی تو جوانی کی شام آئی تھی
ہمیں عجیب لگا زندگی کا ڈھل جانا

☆

زندگی تیری امانت ہے مگر کیا کیجیے
لوگ یہ بوجھ بھی تھک ہار کے رکھ دیتے ہیں

☆

زندگی تیری عطا ہے تو یہ جانے والا
تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا

☆

سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

☆

زندگی کو بھی ترے در سے بھکاری کی طرح
ایک پل کے لیے رکنا ہے گزر جانا ہے

☆

شکوہ ناقدری دنیا کا کریں کیا کہ ہمیں
کچھ زیادہ ہی ملی جتنی محبت چاہی

☆

زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

☆

زندگی! اس سے زیادہ تو نہیں عمر تری
بس کسی دوست کے ملنے سے جدا ہونے تک

فرازؔ کے ان خیالات سے یہی واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے زندگی کو خدا کا انمول تحفہ سمجھا ہے۔ خدا کی عظمت کو بھی خوب سمجھا۔ زندگی کے ہر ایک موڑ پر خدا کا شکر ادا کیا۔ فرازؔ کے مزاج میں قناعت پسندی جھلکتی ہے وہ ہمیشہ اپنے غم سے نہیں، بلکہ دوسروں کے دکھ درد سے پریشان رہتے تھے اور ان سے سبق لیتے ہوئے اپنے حال پر خدا کا شکر ادا کیا ہے اور خدا کی بڑائی کی ہے:

تیرے پیار کے کتنے قصے ہیں تیری ذات کے کتنے حصے ہیں
کہیں رام ہے تو کہیں راون ہے، تری پیت کی چرچائیں ہیں عجب

☆

یہ قناعت ہے اطاعت ہے کہ چاہت ہے فراز
ہم تو راضی ہیں وہ جس حال میں جیسا رکھے

☆

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کرلیں
ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے ہیں

☆

ذرے ذرے میں آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

☆

یہ عمر گریزاں کہیں ٹھہرے تو یہ جانوں
ہر سانس میں مجھ کو یہی لگتا ہے کہ تم ہو

☆

جھیلے ہیں جو دکھ تو نے فراز اپنی جگہ ہیں
پر تم پہ جو گزری ہے وہ اوروں سے تو کم ہے

☆

میں وہاں ہوں جہاں جہاں تم ہو
تم کرو گے کہاں کہاں سے گریز

فرازؔ نے خدائے پاک کی عظمت کو جہاں سمجھا اس کی شناسائی کی وہیں ان کے فکر میں تصوف کی بھی جھلک ملتی ہے۔

کم نہیں طمع عبادت بھی تو حرص زر سے
فقیر تو وہ ہے کہ جو دین نہ دنیا رکھے

☆

تشنگی آنکھوں میں اور دریا خیال میں رہے
ہم نواگر، خوش رہے جیسے بھی حال میں رہے

☆

ہم سے درویشوں کے گھر آؤ تو یاروں کی طرح
ہر جگہ خس خانہ و برفاب مت دیکھا کرو

☆

ہم ایسے فقیروں سے محبت سے ملا کر
تا اور بلندی ترے درجات میں آئے

☆

وا رہنے دے یا رب در توبہ کہ ابھی تو
حسرت ہی کہاں تیرے گنہگار کی نکلی

☆

آدمی کو خدا نہ دکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

☆

فراز کا غم اپنا ذاتی غم نہیں، بلکہ وہ انسانیت کے دکھ درد کے شعلے کو اپنے دل میں سموئے ہوئے تھے۔ وہ زندگی کو اپنے لیے نہیں، بلکہ دوسروں کے لیے جیتے تھے۔ دوسروں کی حالت زار سے پریشان رہتے تھے، خلق غم کو فراز نے اپنا غم محسوس کیا ہے اور تبھی تو وہ پوری انسانیت کو نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اپنے ہی لیے بہانہ دریا
اوروں کے لیے بھی آنکھ نم کر

☆

ہزاروں اور بھی دکھ دل نے پال رکھے ہیں
چلو یہ عشق کا آزار تو، ہوا سو ہوا

☆

کچھ روشنی شہر کو ملی تو
جلتا ہے جلے مکان میرا

احمد فراز کا محبوب خیال یا کسی پرستان کا محبوب نہیں بلکہ ان کا محبوب اسی دنیا کا ہے جس میں ہم آپ رہتے ہیں، جس کی جستجو فراز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، فراز کا محبوب مل کے بچھڑ جانے والا محبوب ہے۔ فراز

کے یہاں وصل سے زیادہ ہجر کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے جو اردو شاعری کی روایت کی علمبردار ہے اور اپنے محبوب کے مسلسل انتظار کے کرب میں خود کو جھلستا محسوس کرتا ہے۔ کہیں اس کی تلاش میں رہ گزاروں کی خاک چھانتے ہیں تو کہیں اس کے انتظار کے خیال میں گم ہو کے کسی دہلیز پر بیٹھے ہیں تو کہیں اپنے محبوب سے التجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر اپنے محبوب کی خواہش اور اس کے انتظار میں فراز نے امید کا دامن آخری سانس تک نہیں چھوڑا ہے:

وہ جو آجاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر

☆

کل ہجر کی شب، روزِ قیامت کی طرح تھی
دن نکلا نہ جاں ہی ترے بیمار کی نکلی

☆

ڈھلتی نہ تھی کسی بھی جتن سے شب فراق
اے مرگ ناگہاں! ترا آنا بہت ہوا

☆

پھر تیرے نہ آنے کی خبر شام میں آئی
زہر اب کی تلخی سی مرے جان میں آئی

☆

دیکھ آکر کبھی ان کو بھی جو تیرے ہاتھوں
ایسے اجڑے ہیں کہ آباد نہیں ہونے کے

☆

یہ عمر بھر کا اثاثہ اسی کے نام تو ہے
اگرچہ میری رفاقت میں چند سال تھی وہ

☆

سامنے عمر پڑی ہے شب تنہائی کی
وہ مجھے چھوڑ گیا شام سے پہلے پہلے

☆

تجھے کھویا تو یوں لگتا ہے جیسے
گنوا دی زندگی بھر کی کمائی

☆

وہ تو کیا آتے شب ہجراں تو کیا کٹتی فراز
بجھ گئیں آخر کو سب شمعیں چراغ جاں سمیت

☆

مدتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ امید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

☆

اب بھی دل تجھ کو صدا دیتا ہے گاہے گاہے
مری جاں مری تمنا، مری دنیا، مرے دوست

☆

عزیز تر تھی جسے نیند شام وصل میں بھی
وہ ترے ہجر میں جاگا ہے عمر بھر کیسا

☆

وعدہ کیا تھا اس نے کسی شام کا کبھی
ہم آج تک ہیں گھر میں چراغاں کیے ہوئے

☆

کاش تو بھی کبھی آ جائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے

☆

کاش تو بھی مری آواز کہیں سنتا ہو
پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدا نے میرے

☆

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
کون آئے گا یہاں کون ہے آنے والا

☆

کیا شام تھی کہ جب ترے آنے کی آس تھی
اب تک جلا رہے ہیں ترے نام کے چراغ

☆

کون آتا ہے مگر آس لگائے رکھنا
عمر بھر درد کی شمعوں کو جلائے رکھنا

☆

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

☆

اے رگ جاں کے مکیں تو بھی کبھی غور سے سن
دل کی دھڑکن ترے قدموں کی صدا لگتی ہے

☆

ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تو

☆

اے مرے ابر گریزاں کب تک
راہ تکتے ہیں پیاسے تیری

☆

سبھی نہیں تھے زمانے سے ہارنے والے
پکارتے رہے تجھ کو پکارنے والے

☆

نہیں آیا مرا جانِ بہاراں
درختوں پر شگوفے آگئے کیا

☆

بھولتی ہی نہیں فراز مجھے
اس کے آنے کے احتمال کی شام

☆

جس کو اندازِ جنوں تو نے سکھائے تھے کبھی
وہی دیوانے ہیں زنجیر بپا تیرے بعد

☆

شہر دل میں تو سدا بھیڑ لگی رہتی ہے
پر ترے واسطے اے جانِ من آ، راستہ ہے

☆

گرچہ امکاں تو بہت کم ہے مگر کیا معلوم
پھر کسی روز کسی شام میں آجائے کوئی

☆

جانے کب سے ہوں کسی خواب جزیرے میں فراز
کاش اس قریۂ گمنام میں آجائے کوئی

☆

فراز کی مشہور غزل جس انتظار کا کرب نمایاں ہوتا ہے:

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ! پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ
کچھ تو مرے پندار محبت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ
اک عمر سے ہوں لذت گریہ سے بھی محروم
اے راحت جاں مجھ کو رلانے کے لیے آ

انتظار کے احساسات کو فراز نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی غزلوں میں جگہ جگہ پیش کیا ہے۔

احمد فراز کی ان فنی خصوصیات کے سبب ہی وہ اردو کے ایک صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ فی زمانہ فیض احمد فیضؔ کے بعد اردو غزل (شاعری) میں کسی کا نام لیا جاتا ہے تو وہ احمد فراز ہی کا نام ہے۔

حوالے:

۱۔ 'احمد فراز کا سماجی رویہ اور مزاحمتی شاعری' ماہنامہ اخبارِ اردو، اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۸ء ص ۶

۲۔ ''احمد فراز کا سماجی رویہ اور مزاحمتی شاعری'' ماہنامہ اخبارِ اردو، اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۸ء ص ۴

احمد فرازؔ کی شاعری میں محبوب کا تصور

مَیں اُس کو دیکھتا رہتا تھا حیرتوں سے فرازؔ
یہ زندگی سے تعارف کی ابتدا تھی مری

احمد فرازؔ کی شاعری کا خمیر عشقِ مجازی سے اُٹھا ہے، جو فرازؔ کے یہاں ایک قوت کے طور پر نظر آتا ہے۔ عشق کے اِسی جذبے سے فرازؔ نے ایک ایسا خواب بُنا ہے، جو انسانی زندگی کے حق میں بہتری کا سامان فراہم کرتا ہے۔ فرازؔ کے یہاں عشق اُس جذبے کا نام ہے، جس کی بدولت دنیا کی کسی بھی جنگ کو جیتا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا مرکزی خیال عشق ہے۔ فرازؔ ؎

اِدھر اُدھر کے بھی کردار آتے جاتے رہے
مرے سخن کا مگر مرکزی خیال تھی وہ

عشق کے تعلق سے فراز کا خیال ہے کہ عشقِ مجازی کے جذبے کی شدت ہی سے دیگر اُمورِ حیات کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اس لیے جو شخص عشق نہیں کر سکتا، وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ عشق میں خود کو لٹا دینے کے درس کو عام کرنے میں یقین رکھتے ہیں ؎

لُٹ چکے عشق میں اک بار تو پھر عشق کرو
کس کو معلوم کہ تقدیر سنور بھی جائے

فرازؔ کے یہاں عشق ہی وہ واحد راستہ ہے، جس پر چل کر خدا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ فرازؔ ؎

اے خدا آج اُسے سب کا مقدر کر دے
وہ محبت کہ جو انساں کو پیمبر کر دے

فرازؔ نے دنیوی اذیتوں اور مصیبتوں کو عشق کے لیے ضروری خیال کیا ہے ؎

فرازؔ ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

یہی وہ جذبہ ہے جو فراز کو اپنے عہد کے شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ راہِ طلب میں ملے ہوئے غم بھی فراز کو عزیز ہیں۔ کیوں کہ راہِ وفا یہیں سے کھلتی ہے ؎

ڈھونڈ اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

فرازؔ نے اپنے عشق کے جذبے کو ایک الگ مقام تک پہنچا دیا ہے، جہاں انسانی رشتوں میں عام طور پر رشتوں کی بنیاد کے دو پہلو ہوتے ہیں دوستی و دشمنی، فرازؔ نے دشمنی جیسے رشتوں میں بھی عشق کا پہلو نکال کر یہ ثابت کیا کہ انسانی زندگی کو سب سے زیادہ پیار و محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ستم گری کا ہر انداز محرمانہ لگا
مَیں کیا کروں مرا دشمن مجھے برا نہ لگا

☆

مَیں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے

ان اشعار میں ایک جیسی کیفیت کا ذکر ہے دونوں جگہ فرازؔ اپنے دل سے مجبور ہیں تاہم فرازؔ کا اپنے دل پر قابو نہیں، عشق فرازؔ کے وجود کا ایسا حصہ ہے۔ جس میں دشمن بھی اُسے اپنا معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذہن کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو وہ خود کو ہی ناداں ٹھہراتا ہے۔

تجھ سے بڑھ کر کوئی ناداں نہیں ہوگا کہ فرازؔ
دشمنِ جاں کو بھی تو جان سے پیارا جانے

یہی وہ نادانی ہے جسے فرازؔ بار بار کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ فرازؔ دشمنی کے انجام سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انھیں اس بات کا پورا علم ہے کہ نفرت سے کچھ نہیں حاصل ہونے والا، بلکہ نفرت انسان کو دھیرے دھیرے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ تبھی تو انھوں نے کہا۔

آ گلے تجھ کو لگا لوں میرے پیارے دشمن
اک میری بات نہیں تجھ پہ بھی کیا کیا گزری

فرازؔ کو معلوم ہے کہ دشمنی کی آگ میں دونوں جلتے ہیں نہ کی صرف دشمن، ایسی آگ میں جلنے سے بہتر ہے۔ پیار و محبت کے پھول دلوں میں کھلائے جائیں۔ کیونکہ یہ زندگی محبت کرنے کے لیے ہی بہت کم ہے

تو اس میں نفرت کی گنجائش کہاں سے نکالی جائے۔ جبکہ

آج دشمن کی موت کا سن کر
یوں لگا مَیں بھی مر گیا کچھ کچھ

دشمن کی موت پر رنج و ملال کسی عام انسان کا کام نہیں بلکہ یہ جذبہ عشق کے تحت ہی پروان چڑھ سکتا ہے۔ ایسے رشتوں میں بھی عشق کا پہلو نکال لینا۔ فرازؔ کے فکری افکار کے بدولت ہی ممکن ہے۔

وہ مروت سے ملا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

یہ جذبہ تبھی پیدا ہو سکتا ہے۔ جب انسان کا دل محبت سے لبریز ہو۔ یہی وہ جذبہ ہے۔ جس کے بنا پر دشمن کے بھی دل میں بڑی آسانی سے محبت کا دِیا روشن کیا جا سکتا ہے۔ فرازؔ نے وہی کیا، جس کے بدلے میں فرازؔ کو اتنی محبتیں لوگوں سے نصیب ہوئیں کہ فرازؔ کو یہ کہنا پڑا۔

محبتیں تجھے اتنی ملیں کہ دل میں ترے
نہ دشمنی نہ عداوت نہ ضد نہ بغض نہ کد

مگر اس کے باوجود بھی فرازؔ کا دل کبھی لوگوں کی محبت سے بے زار نہیں ہوا۔ بلکہ اور چاہت بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ فرازؔ کو خود اس بات کا اندازہ نہیں کہ آخر انھیں لوگوں کی کتنی محبتیں چاہئے۔ جبکہ صورتِ حال یہ ہے۔

اور فرازؔ چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

یہی محبت کا جذبہ ہے جو فرازؔ کو ایک سچا عاشق بنا دیتا ہے۔ جس کے عشق میں صداقت کے ساتھ ساتھ بے باکی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ عشق کے تعلق سے فرازؔ فرماتے ہیں۔

عشق ہے نام انتہاؤں کا
اس سمندر میں اعتدال کہاں

یا پھر اپنے تجربے کی بنا پر عشق کے باب کے متعلق فرازؔ کا انوکھا نظریہ جو بالکل واضح ہے۔

محبت اپنا اپنا تجربہ ہے
یہاں فرہاد و مجنوں معتبر نئیں

احمد فراز کا محبوب خیالی دنیا کا محبوب نہیں جو تصوراتی دنیا کو آباد رکھے اور خواب و خیال میں ہی صرف نظر آئے۔ بلکہ فراز کا محبوب اسی جیتی جاگتی دنیا کا ساکن ہے جس میں ہم آپ رہتے ہیں۔ فراز کے محبوب کو صرف محسوس ہی نہیں بلکہ دیکھا، سنا جاسکتا ہے۔

دیگر شعراء کی طرح فراز نے بھی اپنے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کی ہے اور تعریف ایسی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فراز کا محبوب خیالی نہیں ہے۔ جیسے کہ فراز اپنے محبوب کی آنکھ کی تعریف کچھ اس طرح سے کرتے ہیں۔

اُس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فرازؔ
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

جہاں بیشتر شعراء نے اپنے محبوب کے آنکھوں کے لیے نرگس، میخانہ، پیالہ وغیرہ سے تشبیہ دی ہے وہیں فراز سیدھے سادھے انداز میں اپنے محبوب کے آنکھوں کی تعریف کی ہے۔ جس کا تعلق حقیقی زندگی سے براہِ راست معلوم ہوتا ہے۔ ان کے محبوب کی ایک عام انسان کے جیسی ہیں۔ جس میں درد و غم کی وہ کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے جو مسلسل ہجر کے پہاڑ کو کاٹنے میں لگی رہتی ہے۔ راتوں کو نہ سونے کی وجہ سے آنکھوں میں خمار نمایاں ہے۔ یہی تو فراز کی فن کاری ہے کہ انھوں نے اپنے محبوب کی آنکھوں کو نرگس، میخانہ، پیمانہ، پیالہ نہیں کہا بلکہ ایک عام انسان کے درد کو محسوس کیا اور اپنے محبوب کی آنکھوں میں مکمل طور پر نشہ بھی جذب کر دیا۔

اردو شاعری میں محبوب کے جسم کا تصور بھی عام رہا ہے۔ فراز نے بھی اپنے محبوب کے جسم کی تعریف کی ہے۔

سنا ہے اُس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

فراز نے اپنے محبوب کے جسم کی تصویر ایک نئے انداز میں کھینچی ہے۔ فراز کے محبوب کی بناوٹ اتنی خوبصورت ہے کہ جب اُسے پھول بھی دیکھتا ہے تو وہ کش مکش میں پڑ جاتا ہے کہ مَیں خوبصورت ہوں کہ فراز کا

محبوب، اسی جلن میں وہ بار بار اپنی ہی قبائیں کو کتر کر دیکھتا ہے کہ اب شاید میں خوبصورت ہوں مگر اسے ہر بار محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک نئی تشبیہ ہے جسے ابھی تک اپنے محبوب کے بدن کی خوبصورتی کے لیے اردو شاعری میں پہلی بار استعمال کیا گیا ہے۔

محبوب کے لب کی تعریف تو اردو شاعری میں عام بات ہے۔ کبھی میرؔ نے اپنے محبوب کے لب کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی تھی۔

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

فرازؔ نے بھی اپنے محبوب کے لب کو گلاب سے تشبیہ دی ہے۔ فرازؔ کے کلام میں میر کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ ظاہری بات ہے فرازؔ کو میرؔ سے بھی عقیدت تھی۔

سنا ہے اُس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

فرازؔ نے بھی بات وہی کہی مگر انداز نیا رکھا۔

کافر اردو شاعری کے محبوب کے لیے پامال استعارہ ہے۔ جسے میر درد کا مخصوص استعارہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ فرازؔ نے کچھ اس طرح سے استعمال کیا ہے۔

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اُسی کافر کے ہو گئے

اردو شاعری میں کافر اپنے عاشق کی کوئی بھی بات سنتا نہیں وہ جفا پرست ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت مورت سی ہوتی ہے۔ اس لیے شہر کے لوگ سمجھا رہے تھے۔ کہ کہاں آپ اس کے عشق میں پڑ گئے ہو۔ وہ تو کوئی بات سننے کا بھی روادار نہیں۔ مگر وہ کافر اتنا دل آویز ہے کہ جو لوگ فرازؔ کو سمجھا رہے تھے۔ وہی رفتہ رفتہ اس کافر کے حسن میں گرفتار ہو گئے۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

صورت تھی کہ ہم جیسے صنم ساز بھی گم تھے
مورت تھی کہ ہم جیسے پجاری نہیں بھولے

جو بھی اس کو دیکھتا ہے وہ اُسی کا ہی ہو جاتا ہے۔ اسی کے حسن کے چرچے کرنے لگتا ہے۔ اپنے محبوب کو دیکھنے والوں کی کیفیت کو فرازؔ نے اس طرح سے بیان کیا ہے۔

ہم نے بھی اُس کو دیکھا کل شام اتفاقاً
اپنا بھی حال ہے اب لوگو فرازؔ کا سا

محبوب کی زلف کی چرچا بھی اردو شاعری کا اہم موضوع رہا ہے۔ فرازؔ نے بھی اپنے محبوب کے زلف کی تعریف نئے انداز میں کی ہے۔

ترے ہی طلعت و گیسو کی دھوپ چھاؤں ہے
کہاں کی صبحِ بنارس کہاں کی شام اودھ

رخسار کی بھی تعریف دیکھتے چلیں ۔

سو دیکھ کر ترے رخسار و لب یقیں آیا
کہ پھول کھلتے ہیں گلزار کے علاوہ بھی

محبوب کے باتوں کی تعریف دیکھئے نئے انداز میں۔

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

فرازؔ اپنے محبوب کی باتوں کی کشش میں اس طرح سے گم ہو گئے۔

اُس کی باتیں بھی دل آویز ہیں صورت کی طرح
میری سوچیں بھی پریشاں مرے بالوں جیسی

فرازؔ کے محبوب کی باتیں اس کی صورت کی طرح دل کش ہیں۔ مگر جس طرح سے صورت کا راز نہیں کھلتا اُسی طرح سے اس کی باتوں کا بھی راز نہیں کھلتا۔ جس کی وجہ سے فرازؔ کش مکش میں پڑ گیا ہے۔ اس کی سوچیں اُس کے بالوں کی طرح الجھی ہوئی ہیں۔ یہ بالکل نئے انداز کا شعر ہے۔ جس کا سارا حسن محبوب کی باتوں میں اور سوچوں کے الجھنے میں موجود ہے۔

بہر حال فرازؔ نے اپنے محبوب کے حسن و جمال کی خوب سے خوب تر تعریف کی ہے۔ اور اس دعوے

کے ساتھ کی۔

یہ مرا حسنِ نظر ہے تو دکھادے کوئی
قامت و گیسو و رخسار و دہن تم جیسے

یا پھر

ہونٹ ہیروں سے نہ چہرہ ہے ستارے کی مثال
پھر بھی لادے تو کوئی دوست ہمارے کی مثال

ظاہری بات ہے کسی کا بھی محبوب اس کے لیے دنیا کا سب سے حسین و جمیل ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ لیلیٰ کا حسن دیکھنا ہو تو مجنوں کی نگاہ سے دیکھو۔ ظاہری طور پر لیلیٰ کالی تھی۔ جس میں کوئی خاص بات آپ کو نظر نہیں آئیگی۔ مگر فرازؔ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ میرا حسن نظر نہیں ہے۔ میرے محبوب کے حسن کا کمال ہے۔ یہ اور بات میرے محبوب کا نہ ہی ہونٹ ہیرے سے ہیں اور نہ ہی چہرہ ستاروں سا چمک رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی میرے محبوب کے جیسا ہونٹ، چہرہ، قامت، گیسو، رخسار، دہن وغیرہ اگر کسی اور کے محبوب کا ہو تو وہ میرے سامنے لائے۔ مَیں بھی دیکھو میرے محبوب کے حسن کے مقابل کون ہے۔ مگر لوگ فرازؔ کے محبوب کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

دیکھنے میں تو ہیں سادہ سے خدو خال مگر
لوگ کہتے ہیں کوئی بات ہے جادو والی

فرازؔ نے اپنے محبوب کے حسن کو اس بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ جہاں صرف فرازؔ کے محبوب کے ہی چرچے ہیں۔ اور فرازؔ اپنے محبوب کے حسن کے سمندر میں غوطہ لگا رہے ہیں۔ اور وصل کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

فرازؔ کو یہ بھی نہیں برداشت کہ اس کے محبوب کا کوئی ہم نام ہو۔ کیونکہ فرازؔ جو خوبی اپنے محبوب کے اندر دیکھتے ہیں وہ کسی اور کے یہاں موجود نہیں۔ اب جب فرازؔ کے محبوب میں دنیا بھر کی خوبی موجود ہے۔ تو ظاہری بات ہے۔ اس کے اندر غرور کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ وہ محبوب بھی ہے۔ ویسے بھی اردو غزل کا محبوب حسین سے

حسین رہا ہے۔ مگر ساتھ میں غرور تو اس کے خمیر میں شامل رہا ہے۔ تو فراز کا محبوب کہاں تک بچ سکتا تھا۔

غرورِ دوست سے اتنا بھی دل شکستہ نہ ہو
پھر اُس کے سامنے دامانِ التجا لے جا

ایسا لگتا ہے کہ فراز کو یہ پہلے سے ہی معلوم تھا۔ محبوب کے اندر غرور کا ہونا ضروری ہے۔ تبھی تو وہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہجر کے موسم آنے سے پہلے ہی اپنے محبوب سے التجا کرلو اسے منالو! اب محبوب جفا پرست بھی ہوتا ہے۔ وہ کہاں مانے گا۔ جس طرح سے بہار کے بعد خزاں کا آنا لازمی ہے اسی طرح سے وصل کے بعد ہجر کے موسم آتے ہیں۔ اردو شاعری میں وصل سے زیادہ ہجر کو اہمیت دی گئی ہے۔ سو فرازؔ بھی اپنے محبوب کے ہجر میں رات دن گزار رہے ہیں۔

کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

☆

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

☆

ہُوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تُو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

☆

ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تُو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تُو

ان اشعار سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ فرازؔ اس سے پہلے وصل کی لذت اُٹھا چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے لب پر فریاد ہے۔ مگر ہزار منت و درماں کرنے کے بعد بھی ان کا محبوب ماننے کو تیار نہیں ہے۔ لیکن وہ ہار کے بھی حوصلے کی بات کرتے ہیں۔

مَیں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

اس کے بعد بھی فرازؔ اپنے محبوب کی جفا سے پریشان نہیں بلکہ اسے ہدایت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی انہوں نے محبت کا پہلو نکال لیا۔

تُو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

فرازؔ اپنے محبوب کی جفا سے نہیں بلکہ اس کی نفرت سے پریشان ہیں۔ فرازؔ محبت سے بات چیت کے قائل ہیں۔ وہ ہر معاملے کو محبت سے سلجھانے کے قائل ہیں۔ جہاں محبت ہے وہاں زبردستی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے محبت کے معاملے میں بھی وہ کسی طرح کی زبردستی نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ محبوب کی خوشی میں وہ اپنی خوشی شامل کر کے خود ہی ترکِ تعلق کی پہل کر دیتے ہیں۔

ہمیں نے ترکِ تعلق میں پہل کی کہ فرازؔ
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اُس کا

فرازؔ کے اس رویے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ فرازؔ زندگی کا شاعر ہے۔ ہجر میں بھی محبوب کی خواہش کا پورا خیال رکھا ہے۔ اور محبوب سے بچھڑنے کے بعد بھی زندگی جینے کا سلیقہ لوگوں کو سکھاتا ہوا نظر آتا ہے۔

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اُس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

☆

حوصلہ چاہیے طوفانِ محبت میں فرازؔ
اس سمندر میں تو بس موجِ فنا راستہ ہے

اور اب محبوب کی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

ہم ترے شوق میں یوں خود کو گنوا بیٹھے ہیں
جیسے بچے کسی تہوار میں گم ہو جائیں

دونوں شعر نئے انداز کا ہے بلکہ اردو شاعری میں تہوار میں گم ہونے کی تشبیہ کسی کے یہاں بھی نظر نہیں آتی۔محبوب کی تڑپ اور بے چینی صاف طور پر نمایاں ہیں۔اور فراز اعتراف کرتے ہیں۔

کب مجھ کو اعترافِ محبت نہ تھا فرازؔ
کب مَیں نے یہ کہا ہے سزائیں مجھے نہ دو

مگر کبھی کبھی عاشق کی بھی انا جاگ جاتی ہے۔سو فراز کی بھی انا بھڑک گئی۔

مجھ سے بچھڑ کے تُو بھی روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ مَیں بھی تری خواہشوں میں ہوں

☆

مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی
وہ اِس طرح کہ تجھ پہ بھروسا بلا کا تھا

محبوب کسی کا بھی ہو،اسے اپنے محبوب پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔یہ سچے عشق کی معراج بھی ہے۔مگر محبوب ہمیشہ سے اردو شاعری کا عاشق کی امیدوں پر پورا نہیں اترتا۔اگر ایسا نہ ہو تو محبوب کی اہمیت ہی کیا ہے۔

بلا سے جاں کا زیاں ہو اس اعتماد کی خیر
وفا کرے نہ کرے پھر بھی یار اپنا ہے

فراز کا محبوب محل میں رہنے والی شہزادی نہیں بلکہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والی ایک سمجھ دار دوشیزہ ہے جو عشق کے پیچ وخم سے واقف ہے۔جو عشق تو کرتی ہے مگر اظہار نہیں کرنا چاہتی۔مگر فراز کے بے باک لہجے کی صداقت میں،فراز کو دل ہی دل میں محبت کرتی ہے۔جسے ظاہر نہیں ہونے دیتی۔مگر فراز اس راز کو بھی جاننے میں کامیاب ہیں کہ میرے محبوب کے دل میں کیا ہے۔

تُو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں تیری
یار ! اکثر نہ ہی سہی گاہے بگاہے تو مَیں ہوں

عشق میں یہ اعتماد تب ہی پیدا ہو سکتا ہے جب عاشق کو خود پر بھروسہ ہو، اور فراز کو خود پر بے پناہ بھروسہ ہے۔ تبھی تو کہا

ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں تھے جانِ فراز
کہ تجھ کو ساری خدائی کے بعد یاد آئے

تاہم فراز یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میرے عشق میں وہ شدت ہے جس کی وجہ سے دن رات میرا محبوب مجھے کو یاد کیا کرتا ہے۔ اور مَیں اس کے لیے تڑپتا ہوں یہ عشق نہیں تو اور کیا ہے کہ عمر کے آخری ایام میں بھی اپنے محبوب کے دیدار کے لیے تڑپتے ہیں۔

فراز کے یہاں عشق ان کی ذات کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ فراز اور عشق کو الگ کر دیا جائے تو فراز کی شخصیت میں کھوکھلا پن آجائے گا۔ فراز کی خاص طور پر غزلیہ شاعری میں ایک ایسے بے باک عاشق کی شکل ابھرتی ہے۔ جو دنیا کے غم کو اپنے قلب میں سمونا چاہتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں محبت واپس کرنا چاہتا ہے۔ فراز کے محبت کے درس میں بے باکی کے ساتھ ساتھ صداقت بھی ہے۔ اسلئے ان کے اشعار لوگوں کے ذہن میں گھر بنالیا کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا عشق عام زندگی کی داستان بن جایا کرتا ہے۔ فراز کے یہاں عشق محض ایک تماشا نہیں بلکہ وہ جذبہ ہے۔ جو آدمی کو انسان بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔

(ماحصل)

احمد فراز نے اپنی شاعری میں مستحکم شعری روایت کے تمام زندہ عناصر کو فنی مہارت کے ساتھ سمولیا ہے۔ جس میں کلاسیکی شاعری کی جھلک، پرُسوز مدھم نرم لب ولہجہ، ترنم ریزی، نغمگی، مصوری، سادگی و پرکاری، پیکر تراشی کی ترنگ، علامتوں کی معنویت، تشبیہ، استعارے وغیرہ کی پرُلطف لڑیاں موجود ہیں اور یہی وجہ ہے دنیا کے جن ملکوں میں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں فراز کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مشاعروں میں تو غیر معمولی اہمیت کے حامل رہے۔ آج کی غزل گائیکی کا تصور احمد فراز کے بغیر نہیں کیا جاسکتا ہے فراز کی غزلیں غزل گلوکار مہدی حسن، اقبال بانو، بیگم اختر، غلام علی اور ملکہ پکھراج جیسے کانوں میں رس گھولنے والے ماہرین موسیقی نے خوب گائی ہیں، فراز صرف اردو والوں میں ہی نہیں بلکہ شعری ذوق رکھنے والے ہر حلقوں میں پسند کیے جاتے تھے اور یہی وجہ ہے ان کے مجموعوں کے کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں ہندی میں تو کئی ایڈیشن چھپے ہیں۔

فراز کی شاعری دردِ عشق کی ایک سچی تصویر ہے جس میں وصال سے زیادہ ہجر کا کرب نمایاں ہے۔ جس میں انتظار کی کیفیت اور محبوب کی جستجو نظر آتی ہے جو کہ فراز اپنے محبوب کو پا کے کھونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ اسی جستجو میں فراز نے انسانی زندگی کو محبت کا پیغام دیا ہے، عشق کے درس کو عام کیا ہے، فراز نے زندگی کے حاصل کو عشق کے پیرائے میں دیکھا اور عشق کے جذبے کو فروغ دیا اور کہا بھی، جو انسان اس دنیا میں عشق نہیں کرسکتا وہ زندگی میں کچھ نہیں کرسکتا۔

فراز کے جذبات و احساسات میں اتنی سچائی ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کی حقیقتوں کی ترجمان معلوم ہوتی ہے۔ شاعر کے جذبات و احساسات سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فراز کے اشعار لوگوں کے دل میں گھر کر لیتے ہیں اور ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں۔ فراز سادگی کے ساتھ مدھم لب ولہجہ میں اپنے احساسات و جذبات کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں اور یہ انداز ایک ایسا رنگ اختیار کرلیتا ہے جو ان کی پہچان بن جاتا ہے

جہاں فراز نے ایک طرف اپنی شاعری میں عشق و محبت کے جذبے کو فروغ دیا ہے۔ وہیں

پاکستان میں جبر و استحصال اور اعلیٰ اقدار حیات کی بے حرمتی کے خلاف فیض کے بعد سب سے زیادہ اپنی آواز بلند کی ہے۔فراز جمہوری نظام کے قائل تھے وہ انسانیت کی حکومت چاہتے ،مساوات کا نظریہ رکھتے تھے۔فراز کبھی اپنے غم سے پریشان نہیں ہوئے بلکہ وہ دوسروں کے دکھ درد سے پریشان رہنے والے شخص تھے۔انھوں نے خلق خدا کے غم کو اپنا غم سمجھا،جس کا زندگی کی سچائیوں سے براہ راست تعلق ہے جو وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے انسانی زندگی سے پیار محبت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے وہ انسانیت کی حالتِ زار دیکھ کر خاموش رہنے والے نہیں تھے،بلکہ ان کے لیے حکومت کے سامنے اپنی آوازِ احتجاج بلند کی اور اس کے بدلے میں فراز کو بہت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔جلاوطنی تک اختیار کرنی پڑی۔مگر فراز نے اپنی حق گوئی کی آواز کو کبھی مدھم نہیں ہونے دیا اور انسانی اقدار کی حرمت کے لیے لڑتے رہے۔یہی وجہ ہے ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف غم جاناں کا ذکر ملتا ہے وہیں دوسری طرف غم دوراں کا غم بھی شامل ہے۔جس میں دھوپ اور چھاؤں کی کیفیت موجود ہے

فراز نے اپنے عہد کے سماجی مسائل کی سنجیدہ پیشکش کے ساتھ عصری صورت حال کا آئینہ پیش کیا ہے ان کی ''بنگلہ دیش''''سرحدیں''''قلم سرخرو ہے''''پچھلا پہر''''پہلی آواز''''جو سزا ہم کو ملے''''شہر نامہ''''دوسری ہجرت''وغیرہ بہت سی نظمیں ہیں جو گواہی دیتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ انسانیت یہی سب کچھ ہے۔اور ظلم بدنما داغ کی طرح اوراق کے جسم پر نمایاں ہے۔

فراز نے بھلے ہی اپنی شاعری میں کوئی فلسفہ کی بات نہ کی ہو،مگر ان کی غزلوں میں معنی آفرینی موجود ہے اور یہی معنی آفرینی کا ہنر بڑے فنکاروں ہی کو نصیب ہوتا ہے جو چھوٹے سے چھوٹے تجربے کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان میں معنی کی کئی پرتیں اپنے آپ ہی کھلتی چلی جاتی ہے۔جو فراز کے یہاں موجود ہے:

فراز نے صرف انسانی رشتوں کی قدر نہیں کی،بلکہ خدا کی عظمت کو بھی خوب سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں قناعت پسندی جھلکتی ہے وہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔

فراز نے زندگی کے ہر ایک رشتے میں خلوص،پیار،محبت،چاہت کو عام کیا ہے اور عشق کو پروان

چڑھایا ہے یہاں تک کہ وہ دشمنوں کو بھی ہمیشہ گلے لگانے کی بات کرتے ہیں ان کے دلوں میں بھی محبت کا دیپ جلانے کی کوشش کرتے ہیں:

فرازؔ یوں تو کسی خاص نظریے سے وابستہ نہیں تھے مگر ان کے احتجاج کی آواز اور درد نے اُن کی شاعری میں ترقی پسندی کی جھلک ضرور پیدا کر دی ہے۔ ویسے بھی فرازؔ سب سے زیادہ اگر کسی شخصیت سے متاثر تھے تو وہ فیضؔ ہیں تو ظاہر سی بات ہے کچھ نہ کچھ خوبی فرازؔ کے یہاں موجود ہونا ضروری ہے اور اسی بنا پر بہت سے ناقدین نے فرازؔ کو فیضؔ کا جانشین قرار دیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ فیضؔ کی جانشینی ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ فرازؔ ہی کو نصیب ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں انکی نظم "مسیحا"، "شاعر"، "وابستگی"، "جو سزا ہم کو ملے"، "بنگلہ دیش"، "محاصرہ"، "شہر آشوب"، "قلم سرخرو ہے" وغیرہ۔ قابل ذکر ہیں۔

ایک طرف فرازؔ جدید نظم گوئی کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو روایت سے انحراف کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہیں دوسری طرف فرازؔ کی غزلوں میں روایتی غزل اور نئی غزل کے واضح اشعار لئے موجود ہیں جو روایت اور جدیدیت دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

روایتی غزل کے اشعار:

کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوانے جا
فرازؔ اور اسے حالِ دل سنانے جا

☆

فقیہہ شہر جبیں پر کلاہِ زر رکھے
سنا رہا ہے ہمیں آیتیں مقدر کی

☆

چلو یہ سیل بلا خیز ہی بنے اپنا
سفینہ اس کا خدا اس کا ، ناخدا اس کا

☆

مرے نہ ہار کے ہم قیس و کوہکن کی طرح
اب عاشقی میں ہماری مثال جو بھی ہو

☆

جنس ہنر کا کون خریدار ہے فراز
ہیرا، کہ پتھروں سے بھی سستا دکھائی دے

کچھ نئی غزل کے اشعار:

تھامے رہو گے جسم کی دیوار تابکے
یہ زلزلہ تو روح کے اندر لگے مجھے

☆

اجاڑ پیڑ، گئے موسموں کو روتے ہیں
ہر آبجو کو ہوس پی گئی سمندر کی

☆

مرے وجود کا صحرا ہے منتظر کب سے
کبھی تو آ جرسِ غنچہ کی صدا کی طرح

☆

غریب شہر کسی سایہ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سرو و سمن

☆

اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے

☆

میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے
اداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

☆

یہ تو اک شہر جنوں ہے چاک دامانو ! یہاں
سب کے سب وحشی ہیں کس کو کون زندانی کرے

☆

تو پاس بھی ہو تو دل بے قرار اپنا ہے
کہ ہم کو تیرا نہیں انتظار اپنا ہے

فرازؔ نے تشبیہات، استعارے، علامات، محاکات، پیکر تراشی کو اپنے شعری پیکر میں ڈھالا ہے مگر انکی تخلیقی فضا تشبیہات اور علامت نگاری سے قائم ہوتی ہے فرازؔ نے اپنے شعری پیکر کو روایت کے ساتھ ساتھ نئے تقاضوں میں ڈھالا ہے ان کی تشبیہات کے کچھ اشعار جس میں فرازؔ کی نئی آواز سنائی دیتی ہے جس کو انہوں نے نئے لباس سے آراستہ کیا ہے کچھ تشبیہات تو ایسی ہیں کہ فرازؔ کے علاوہ اردو شاعری میں شاید کسی نے نہیں پیش کیں۔

فرازؔ کے علامتی اشعار جس سے انھوں نے اپنی تخلیقی فضا بنائی ہے چراغ، آگ، سورج اور سمندر کو زیادہ تر اپنے علامتی اشعار میں ڈھالا ہے

فرازؔ نے اپنے کلام میں بہت سی صنعتوں کا استعمال کیا ہے جیسے تضاد، مراعاۃ النظیر، سوال جواب، تلمیح، حسن تعلیل وغیرہ۔

فرازؔ یوں تو غزل اور نظم دونوں کے شاعر ہیں مگر میری نظر میں بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر وہ ہیں، نظم کے مقابلے میں غزل بڑی ہنرمندی سے کہنے کا فن جانتے تھے۔ وہ دو مصرعوں میں اپنی بات پوری نظم کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے کہہ جاتے تھے اور وہ بھی بڑی سادگی اور موثر انداز میں، اتنے موثر انداز میں کہ بات دل میں گھر کر جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ فرازؔ کی غزل کے اشعار لوگوں کے ذہن میں نقش رہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں مضامین کی تکرار یا تو بالکل نہیں ہے یا پھر کہیں کہیں خال خال موجود ہے۔

فراز اپنے عہد کے ان شعراء میں سے ہیں جنہوں نے عشق کے درس کو عام کیا۔ اور اعلیٰ اقدار حیات کی بے حرمتی کے خلاف اپنی آواز بلند کی، عصری حالات پر گہری نظر رکھی، انسانی رشتوں کا احترام کیا اور خدا کی عظمت کو خوب سمجھا بھی۔

فراز کی شاعری کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے ممتاز شعرا کی فہرست میں ان کا شمار ضرور ہوگا۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ شاعروں کی اتنی بڑی کہکشاں میں انھوں نے اپنے لیے ایک قابل فخر مقام بنالیا ہے۔

احمد فراز کے منتخب اشعار بقید عنوان

تلاش و جستجو

جستجو رائیگاں نہیں تھی مگر
جن کو چاہا تھا وہ نہیں پائے

*

فرازؔ داد کے قابل ہے جستجو اُن کی
جو ہم سے دربدروں کو تلاش کرتے ہیں

*

تجھے دوسروں سے ملا ہے یہ مری جستجو کا صلہ ہے یہ
ترے تخت و تاج سے قیمتی ہے یہ گرد میرے کھڑاؤں کی

جرس

یادِ ایام کہ صحرائے محبت میں فرازؔ
جرسِ قافلۂ دل کی صدا زندہ تھی

*

کون کرتا ہے کوچ بستی سے
دل کسی کا جرس میں رکھا ہے

غبار، راہ و راہبر

رہِ وفا میں حریفِ خرام کوئی تو ہو
سو اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں

*

لب تشنۂ خوں کب سے ہے اک اک مژۂ یار
وا اے دہنِ زخمِ جگر راہِ سخن کر

تمیز رہبرو رہزن ابھی نہیں ممکن
ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

قافلہ

وہم تھا قافلۂ ہم سفراں
مڑ کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا

*

تو لوٹ کر بھی اہلِ تمنا کو خوش نہیں
یاں لٹ کے بھی وفا کے انہی قافلوں میں ہوں

*

ہمسفر چاہیئے ہجوم نہیں
اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

بگولہ

ہم بگولوں کی طرح خاک بسر پھرتے ہیں
پاؤں شل ہوں تو یہ آشوبِ سفر بھی جائے

*

ایسی نفرت تھی کہ اس شہر کو جب آگ لگی
ہر بگولہ خس و خاشاک پہن کر نکلا

*

اس خرابے میں بگولہ سی پھرے ہے کس کی یاد
اس دیارِ رفتگاں میں ہاؤ ہو کرتا ہے کون 9

آبلۂ پا

فرازؔ بھول بھی جا سانحے محبت کے
ہتھیلیوں پہ نہ اِن آبلوں کو پال کے رکھ

*

کیا قیامت ہے کہ جن کیلئے رُک رُک کے چلے
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

*

دل دھڑکتا نہیں ٹپکتا ہے
کل جو خواہش تھی آبلہ ہے مجھے

سفر

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

*

مگر کسی نے ہمیں ہم سفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ سب کے گئے

*

اب رفتگاں کی بات نہیں کارواں کی ہے
جس سمت بھی ہو گردِ سفر جانا چاہیے

مسافر

ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تُو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تُو

مَیں کہ صحرائے محبت کا مسافر تھا فرازؔ
ایک جھونکا تھا کے خوشبو کے سفر پر نکلا

*

ہماری دربدری کا یہ ماجرا ہے کہ ہم
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

*

ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل شوق سفر بھی نہیں جاتا

منزل

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہمسفر کو دیکھتے ہیں

*

پہنچ گئے سرِ منزل بخوبیٔ قسمت
مگر وہ لطف کہاں ساتھ ساتھ چلنے کا

*

آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا
اور کچھ ایسے کہ مجھے خواہش منزل نہ رہی

قرب و دوری

یہ قرب کیا ہے یکجاں ہوئے نہ دور رہے
ہزار ایک ہی قالب میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

*

اتنی شدت سے نہ مل تو کہ جدائی چاہیں
یہی قربت تری دوری کا بہانہ بن جائے

*

یہ قربتوں میں عجب فاصلے پڑے کہ مجھے
ہے آشنا کی طلب آشنا کے ہوتے ہوئے

پہلو

اپنی باہوں میں سمٹ آئی ہے وہ قوسِ قزح
لوگ تصویر ہی کھینچا کیے انگڑائی کی

*

مری گردن میں باہیں ڈال دی ہیں
تم اپنے آپ سے اُکتا گئے کیا

جبیں

خود میرا ہاتھ جب میری بربادیوں میں تھا
تیری جبیں پہ کیوں عرق انفعال ہو

*

سنا ہے آئنہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

*

میں تیرے لطفِ فراواں کا معترف ہوں مگر
حسین و خندہ جبیں میزبان تھی وہ بھی

*

آنکھیں

سنا ہے درد کی گاہک ہے چشم ناز اس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

*

تری آنکھوں کے آگے کب سے نرگس
کھڑی ہے لے کے کشکولِ گدائی

*

پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یوں نہ دیکھ مجھے
تجھے تلاش ہے جس شخص کی وہ مر بھی گیا

*

دن کے ڈھلتے ہی اُجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں

آئینہ رخ

اک روپ کہ آئینہ ترخ جائے
اک دھوپ رخِ نگار جیسی

*

اس ایک شخص کی سج دھج غضب کی تھی کہ فرازؔ
مَیں دیکھتا تھا، اُسے دیکھتا تھا آئینہ

*

جسم

بارشِ سنگ کا موسم ہے مرے شہر میں تو
تُو یہ شیشے سا بدن لے کے کہاں آگئی دوست

*

جسم بلور سا نازک ہے جوانی بھرپور
اب کے انگڑائی نہ ٹوٹی تو بدن ٹوٹے گا

رخسار

سو دیکھ کر ترے رخسار و لب، یقیں آیا
کہ پھول کھلتے ہیں گلزار کے علاوہ بھی

*

مگر کبھی کوئی دیکھے کوئی پڑھے تو سہی
دل آئنہ ہے تو چہرہ گلاب جیسا ہے

خال

دیکھنے میں تو ہیں سادہ سے خدوخال مگر
لوگ کہتے ہیں کوئی بات ہے جادو والی

*

یہ خال و خد یہ وجاہت یہ تندرست بدن
گرجتی گونجتی آواز استوار جسد

*

غزل میں جیسے ترے خدوخال بول اُٹھیں
کہ جس طرح تری تصویر بات کرنے لگے

زلف

ترے ہی طلعت و گیسو کی دھوپ چھاؤں ہے
کہاں کی صبحِ بنارس کہاں کی شام اودھ

*

اک لعنتِ سنگ سر بہ زانو
اک زلف ہے آبشار جیسی

*

زلف راتوں سی ہے رنگت ہے اُجالوں جیسی
پر طبیعت ہے وہی بھولنے والوں جیسی

قامت

تیرے قامت سے بھی لپٹی ہے امر بیل کوئی
میری چاہت کو بھی دنیا کی نظر کھاگئی دوست

*

یہ مرا حسنِ نظر ہے تو دکھا دے کوئی
قامت و گیسو و رخسار و دہن تم جیسے

ہاتھ

کبھی تو دستِ حنائی سے سرخیٔ لب سے
ہمارے زخمِ تمنا کو پھول کر جاناں

*

شاخِ امید پہ کھلتے ہیں طلب کے غنچے
یا کسی شوخ کے ہاتھوں میں حنا لگتی ہے

لب و دہن

سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

*

یاقوت سے لب سرو سا قد رات سی آنکھیں
وہ جانِ قیامت تھی مرے گھر مرے آگے

*

دل یہ بھی چاہتا ہے کہ اُن پھول سے لبوں کو
دستِ صبا پہ رکھ کر شبنم کے ہار بھیجیں

ابر

ابرِ بہار اب کے بھی برسا پرے پرے
گلشن اُجاڑ اُجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

*

گرج برس کے نہ ہم کو ڈبو سکے بادل
تو یہ ہوا کہ وہی بادباں ہمارے تھے

*

نہ مزاجِ ابرِ کرم کا ہے نہ علاجِ بارشِ غم کا ہے
تری دستی کو مَیں کیا کروں، جو نہ دھوپ کی ہے نہ چھاؤں کی

باغ

اک باغِ مراد اُجڑ رہا ہے
اک دھوم سی ہے بہار جیسی

اب باغ و باغباں سے کوئی کیا گلہ کرے
اب کے تو رنگِ گل سے چمن میں لگی ہے آگ

*

یہ ہم جو باغ و بہاراں کا ذکر کرتے ہیں
تو مدعا وہ گل تر وہ سرو قامت ہے

برگ

مَیں برگِ آخرِ شہرِ خزاں تھا خاک ہوا
کھلا کہ موسم گل کا سفیر مَیں بھی نہ تھا

*

تو بھی خوشبو ہے مگر میرا تجسس بے کار
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

برسات

اے فرازؔ ایسے میں برسات کٹے گی کیوں کر
گر یونہی شام و سحر رونے کے عادی روئے

*

اے مرے ابرِ گریزاں میری آنکھوں کی طرح
گر برسنا ہی تجھے تھا تو برستا جاتا

*

اپنی قسمت کہ گھٹاؤں میں بھی جلتے ہیں فرازؔ
اور جہاں وہ ہیں وہاں ابر کا سایہ برسا

*

بہار

ہم تو یوں خوش تھے کہ اک تار گریبان میں ہے
کیا خبر تھی کہ بہار اس کے بھی ارمان میں ہے

*

مَیں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

*

اب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
کبکِ دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا

خزاں

اے خوشا عہدِ خزاں جب نغمہ پیرائی تو تھی
اب تو سرمہ در گلو ہیں خوشنوایانِ بہار

*

ہم نے دیکھا ہے خزاں میں بھی تری آمد کے بعد
کون سا گل تھا کہ گلشن میں تروتازہ نہ تھا

*

آخری شام خزاں ٹوٹ کے یاد آتی ہے
پھر نشیمن ہی مرا تھا نہ چمن میرا تھا

چمن

بہارِ قرب سے پہلے اُجاڑ دیتی ہیں
جدائیوں کی ہوائیں محبتوں کے چمن

تو ساتھ چمن میں ہو تو پھر رشک کے مارے
پھرتے ہیں کئی سرو و صنوبر میرے آگے

*

کہیں تارِ دامن گل ملے تو یہ مان لیں کہ چمن کھلے
کہ نشان فصلِ بہار کا سرِ شاخسار کوئی تو ہو

غنچہ

صبحدم چھوڑ گیا نکہتِ گل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

*

کبھی اس یارِ سمن بر کے سخن بھی سنیو
ایسا لگتا ہے کہ غنچے سے چٹکتے جاویں

گل

تم بگولوں کے خداوند سہی
آتش گل تو فرو کر دیکھو

*

گر یونہی باد صبا اٹکھیلیاں کرتی پھری
شعلہ گل سے بھڑک اٹھے گا دامانِ بہار

*

اتری تھی شہرِ گل میں کوئی آتشیں کرن
وہ روشنی ہوئی کہ سلگنے لگے بدن

گلچیں

اب بھی خوابِ گل ہے پریشاں اب بھی اسیر عنادل ہیں
کل بھی باغ میں گلچیں اور صیاد خدا کہلاتے تھے

*

باغباں گلچیں کو چاہے جو کہے ہم کو تو پھول
شاخ سے بڑھ کر کفِ دلدار پر اچھا لگا

*

ہم کو گلچیں سے گلہ ہے گل و گلشن سے نہیں
تجھ کو آنا ہے تو اے بادِ صبا بسم اللہ

ادب

ہزار شکر کہ ہم اہلِ حرفِ زندہ نے
مجاورانِ ادب سے سند نہیں مانگی

*

آدابِ خرابات کا کیا ذکر یہاں تو
رندوں کو بہکنے کی ادا تک نہیں آتی

*

آئے تری محفل میں تو بے تاب بہت تھے
جو اہلِ وفا واقفِ آداب بہت تھے

بزم

ایک دنیا منتظر ہے اور تیری بزم میں
اس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں

شائد ہو تجھے یاد کہ اے صاحب محفل
اک سوختہ جاں بزم چراغاں میں پھرے تھا

*

حال دل کا بھی آنکھ پر نہ کھلے
سخت تنہا تھے اس کی بزم میں ہم

خلوت

خود کو عمروں سے مقفل کئے بیٹھا ہوں فرازؔ
وہ کبھی آئے تو خلوت کدۂ جاں کھولوں

*

تو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں تیری
یار! اکثر نہ سہی گاہے بگاہے تو میں ہوں

انجمن

ہم لے تو آئے ہیں تجھے اک بے دلی کے ساتھ
اس انجمن میں اے دلِ بیتاب دیکھنا

*

شریک بزم دل بھی ہیں چراغ بھی ہیں پھول بھی
مگر جو جانِ انجمن تھا وہ کہاں چلا گیا

دربان

ان کی دہلیز پہ سائل ہیں جنہیں
درد مندوں سے ہیں دربان عزیز

*

ہم تج کے چلے آتے ہیں یارو درِ جاناں
غالبؔ کی طرح منتِ درباں نہیں کرتے

*

اک آدھ کوئی صاحبِ دل بھی ہے فروکش
اب کوچۂ دلدار میں درباں ہیں زیادہ

شمع

تم اپنی شمعِ تمنا کو رو رہے ہو فرازؔ
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

*

شمع رویوں کی محبت میں یہی ہوتا ہے
رہ گیا داغ فقط دل کی نشانی لوگو

*

وہ تو کیا آتے شبِ ہجراں تو کیا کٹتی فرازؔ
بجھ گئیں آخر کو سب شمعیں چراغِ جاں سمیت

ایمان وکفر

فرازؔ تجھ کو خداوند مانتا ہے اسے
دیارِ عشق میں اپنا رسول کر جاناں

*

یہ لوگ میری فردِ عمل دیکھتے ہیں کیوں
مَیں نے فرازؔ خود کو پیمبر نہیں کہا

*

یہ قناعت ہے اطاعت ہے کہ چاہت ہے فرازؔ
ہم تو راضی ہیں وہ جس حال میں جیسا رکھے

*

بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فرازؔ
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں

*

دین و دل تو کھو بیٹھے اب فرازؔ کیا غم ہے
کوئے یار میں غارت آبرو بھی ہو جائے

وہم و یقین

تو سامنے ہے تو پھر کیوں یقیں نہیں ہوتا
یہ بار بار جو آنکھوں کو مَل کے دیکھتے ہیں

ابتدا و انتہا

مَیں اس کو دیکھتا رہتا تھا حیرتوں سے فرازؔ
یہ زندگی سے تعارف کی ابتدا تھی مری

*

عشق ہے نام انتہاؤں کا
اس سمندر میں اعتدال کہاں

*

شاخوں نے خود اتار دیے اپنے پیرہن
اس انتہائے قرب نے دھندلا دیا تجھے

*

شکایت اس کی نہیں ہے کہ اس نے ظلم کیا
گلہ تو یہ ہے کہ ظالم نے انتہا نہیں کی

*

وارفتگی میں دل کا چلن انتہا کا تھا
اب بت پرست ہے جو نہ قائل خدا کا تھا

انجام

خوش ہو اے دل کہ محبت تو نبھا دی تو نے
لوگ اُجڑ جاتے ہیں انجام سے پہلے پہلے

*

رہا ہے کون کس کے ساتھ انجام سفر تک
یہ آغاز مسافت ہی سے ہم تم جانتے تھے

دنیا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آگئی
تیرے ہاتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھتا

*

کم نہیں طمع عبادت بھی تو حرص زر سے
فقر تو وہ ہے کہ جو دین نہ دنیا رکھے

*

غم دنیا تو وہ قلزم ہے کہ دل کا مضمون
غرق ہوتا چلا جاتا ہے کنارے کی مثال

*

آسمان

وہ تفاوتیں ہیں مرے خدا کہ یہ تو نہیں کوئی اور ہے
کہ تو آسمان پہ ہو تو ہو، یہ سر زمیں کوئی اور ہے

*

مطابقت تو نہیں پر مماثلت ہے بہت
تو آسمان سہی سائبان تھی وہ بھی

*

یہ لگ رہا ہے ستاروں کی چال سے کہ فلک
کوئی عذاب مری خاک پر اُتارے گا

آفتاب

جسم شعلہ ہے جبھی جامۂ سادہ پہنا
میرے سورج نے بھی بادل کا لبادہ پہنا

*

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

*

وہ ایک شخص کی سورج کے روپ میں آیا
چرا کے لے گیا شمعیں فرازؔ ہر گھر کی

چاند

سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بام فلک سے اُتر کے دیکھتے ہیں

جانے کب ابھرے تری یاد کا ڈوبا ہوا چاند
جانے کب دھیان کوئی ہم کو اڑا لے جائے

*

کل کا سورج حشر در آغوش نکلے گا فرازؔ
چاند جیسی صورتیں ایندھن بنا دی جائیں گی

کہکشاں

رات بھر تاروں کی صورت جاگتے رہنا ہمیں
صبح دم کہنا کہ کیا کیا خواب شب آنکھوں میں تھے

*

راتوں کو تری یادوں کے خورشید اُبھرتے
آنکھوں میں ستارے سے اترتے کوئی دن اور

*

جو اشک جذب ہوئے میری تیری آنکھوں میں
یہاں تو زخم بنے ہیں وہاں ستارے ہوئے

رِندی

رند ہیں بھرے بیٹھے اور مے کدہ خالی
کیا بنے جو ایسے میں ایک "ہو" بھی ہو جائے

*

اے تُو کہ تیرے در پہ ہیں رندوں کے جمگھٹے
اک روز اس فقیر کے گھر آ، شراب پی

*

آدابِ خرابات کا کیا ذکر یہاں تو
رندوں کو بھٹکنے کی ادا تک نہیں آئی

سزا

اب کوئی فیصلہ ہو بھی تو مجھے کیا لینا
میں تو کب سے ہوں سرِ دار، سزا ہونے تک

*

ہوں سزا وارِ سزا کیوں جب مقدر میں مرے
جو بھی اس جانِ جہاں نے لکھ دیا میں نے کیا

قیامت

ہر گھر کا دِیا گل نہ کرو تم کہ نہ جانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

*

اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اک واقعہ ذرا سا

*

کل ہجر کی شب، روزِ قیامت کی طرح تھی
دل نکلا نہ جاں ہی ترے بیمار کی نکلی

گناہگار، گناہ، خطاء

اس شہر میں ہو جنبش لب کا کسے یارا
یاں جنبشِ مژگاں بھی گنہگار کرے ہے

*

گناہگار تو ہوں پر نہ اسقدر کہ مجھے
صلیب روزِ مکافات کی لگے بوجھل

تیری معصوم نگاہی پہ بھی حرف آئے گا
صرف مجھ کو ہی گنہگار نہ ٹھہرا مرے دوست

*

بھلا ہوا ہم گنہگاروں نے ضد نہیں کی
سمیٹ کر لے گیا ہے ناصح ثواب سارے

عشق

لٹ چکے عشق میں اک بار تو پھر عشق کرو
کس کو معلوم کہ تقدیر سنور بھی جائے

*

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

بے وفا

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تُو میرا نہ تھا

*

وہ زندگی ہو کہ دنیا فرازؔ کیا کیجیے
کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے

*

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فرازؔ کب تک
جو تمہیں بھلا چکا ہے اُسے تم بھی بھول جاؤ

*

سنے گا کون تری بے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسم زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

*

مَیں کیا بتاؤں کہ کیوں اُس نے بے وفائی کی
مگر یہی کہ کچھ ایسا مزاج اُس کا تھا

*

مجھ پہ اپنا جرم ثابت ہو نہ ہو لیکن فرازؔ
لوگ کہتے ہیں کہ اُس کو بے وفا مَیں نے کیا

محبت

اے خدا آج اُسے سب کا مقدر کر دے
وہ محبت کہ جو انساں کو پیمبر کر دے

*

شہر والوں کی محبت کا مَیں قائل ہوں مگر
مَیں نے جس ہاتھ کو چوما وہی خنجر نکلا

*

تو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

ترکِ عشق

اب تو ترکِ وفا کا وقت آیا
تو میرا جواب ہو چکا ہے

*

فرازؔ ترکِ تعلق تو خیر کیا ہوگا
یہی بہت ہے کہ کم کم ملا کرو اس سے

*

ہمی نے ترکِ تعلق میں پہل کی کہ فرازؔ
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اس کا

امید

اب فرازؔ اپنے مسیحا سے بھی امید نہ رکھ
وہ تنگ دل ہے ترے زخم میں گہرائی بہت

*

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لئے آ

*

اب کسے ساحل امید سے تکتا ہے فرازؔ
وہ جو اک کشتئ دل تھی اسے غرقاب سمجھ

آرام

ہوتے رہے دل لمحہ بہ لمحہ تہہ و بالا
وہ زینہ بہ زینہ بڑے آرام سے اترے

*

اتنے آرام طلب ہو تو محبت میں فرازؔ
میرؔ بن جاؤ گے فرہاد نہیں ہونے کے

*

یہ رتجگے قبول کہ آرام سے تو ہیں
رکھتے تھے ورنہ خواب ، پریشاں کئے ہوئے

پروانہ

دیر سے سوچ میں ہیں پروانے
راکھ ہو جائیں یا ہوا ہو جائیں

*

پروانہ وار شہر میں کیا کیا پھری ہوا
آخر چراغِ کشتہ پہ میرے گری ہوا

بلبل

بلبلیں قید تھیں تو پھولوں کے
دامنوں پر نشان کیسے پڑے

قفس

صیاد و نگہبانِ چمن پر ہے یہ روشن
آباد ہمیں سے ہے نشیمن بھی قفس بھی

*

خوشنوایانِ چمن سب ہیں اسیرانِ قفس
اب کے زنداں بھی تو گلزارِ عنادل ٹھہرا

*

پھر قفس میں شور اُٹھا قیدیوں کا اور صیاد
دیکھنا اُڑا دے گا پھر خبر رہائی کی

دام

میں تھک گیا تھا بہت پے بہ پے اڑانوں سے
جبھی تو دام بھی اس بار آشیانہ لگا

*

چاروں طرف ہیں دام شنیدن بچھے ہوئے
غفلت میں طائرانِ معانی کے پر نہ کھول

*

کب تک غم دوراں مجھے فتراک میں رکھتا
آخر کو تو دنیا بھی مرے دام میں آئی

دوست

اب اس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہیں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

*

تیور تھے بے رخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

تکلف

نہ اعتبار نہ آسودگی نہ قرب ترا
فقط تکلف دیوار و در ہے، گھر کیسا

*

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

تکلف بر طرف اے جانِ خوباں
کبھی ہم سے بھی مل بیباک ہو کر

شکر

ہزار شکر کہ ہم اہلِ حرفِ زندہ نے
مجاورانِ ادب سے سند نہیں مانگی

*

ایسے قاتل کو کوئی ہاتھ لگاتا ہے فرازؔ
شکر کر شکر کہ وہ دشمن جاں خواب میں تھا

*

اے شکوہ سنج شدتِ اغیار ، شکر کر
تجھ کو لگے نہیں ہیں کسی آشنا کے ہاتھ

ملاقات

پیمانے کو ہم منہ سے لگاتے نہ لگاتے
ساقی کی ملاقات ہی توبہ شکنی تھی

*

یونہی دو دن کی ملاقات ہے اِترا نہ فرازؔ
ہے کہیں یار کی محفل میں جگہ بھی تیری

*

اک ملاقات سرِ رہ بھی سہی جرم مگر
ہم کہیں آپ کہیں لوگ بھی دیوانے ہیں

چارہ گر

یہ جاں کنی کی گھڑی کیا ٹھہر گئی ہے کہ ہم
کبھی قضا کو کبھی چارہ گر کو دیکھتے ہیں

*

یہ طبیعت ہے تو خود آزار بن جائیں گے ہم
چارہ گر روئیں گے اور غم خوار بن جائیں گے ہم

*

نشتر چبھے ہوئے تھے رگِ جاں کے آس پاس
وہ چارہ گر تھا اور مجھے ڈر بھی اسی کا تھا

حیات و موت

سو رہو موت کے پہلو میں فرازؔ
نیند کس وقت نہ جانے آئے

*

آج دشمن کی موت کا سن کر
یوں لگا میں بھی مر گیا کچھ کچھ

*

سجی سجائی ہوئی موت زندگی تو نہیں
مورخوں نے مقابر کو بھی محل جانا

*

اترا بھی تو کب درد کا چڑھتا ہوا دریا
جب کشتیٔ جاں موت کے ساحل سے لگی تھی

سانس

جانے کب آئے نظر مصرعۂ تر کی صورت
جانے کب سانس چلے سینے میں آرے کی مثال

*

نقدِ جاں صرف ہوا کلفتِ ہستی میں فرازؔ
اب جو زندہ ہیں تو کچھ سانس ادھارے لے کر

*

زندگی تھی کہ قیامت تھی کہ فرقت تیری
ایک اک سانس نے وہ وہ دیے آزار کہ بس

کفن

کوئی تو لالہ خونیں کفن سے بھی پوچھے
یہ فصل چاک جگر کی ہے یا بہار کی ہے

*

تو کبھی غور سے دیکھ اپنی قبائے ریشم
تیرے خلعت میں کوئی تارِ کفن میرا تھا

*

خلعتِ شہر یار کو سب نے قبول کر لیا
میں بھی اسے کفن کہوں تو بھی اسے کفن کہے

عبادت

ہاتھ اٹھائے ہیں مگر لب پہ دعا کوئی نہیں
کی عبادت بھی تو وہ جس کی جزاء کوئی

واعظو میں نے بھی انساں کی عبادت کی ہے
پر کوئی نقش نہیں ہے مری پیشانی پر

ساقی

نظم میخانہ کچھ ایسا ہی رہا ہے کہ ہمیں
کبھی ساقی کبھی مینا کبھی ساغر نہ ملا

*

سرشار تو ہو جاتے ہیں سرکش نہیں ہوتے
ساقی کی نگاہیں ہیں عناں گیر خرابات

شراب

کون پی جاتا ہے آخر مرے حصے کی شراب
میں نہیں ہوتا تو پھر خالی سبو کرتا ہے کون

*

ہے زہرِ عشق ، خمارِ شراب ہے آگے
نشہ بڑھاتا گیا ہے یہ سانپ ڈستے میں

*

بس یہ کہا تھا دل دوا ہے مغاں کے پاس
ہم نے شراب کو کبھی شافی نہیں کہا

واعظ

یہ سانحہ ہے کہ واعظوں سے الجھ پڑے ہم
یہ واقعہ ہے کہ پی رہے تھے شراب سارے

*

میکدے کے ادب آداب سبھی جانتے ہیں
جام ٹکرائے تو واعظ نے کہا بسم اللہ

*

میخوار کی واعظ یہاں گردن زدنی ہے؟
کچھ تو ہی بتا صاحبِ تفسیر خرابات

خواب

تتلی کے تعاقب میں کوئی پھول سا بچہ
ایسا ہی کوئی خواب ہمارا بھی کبھی تھا

*

ہم سے تعبیر خواب پوچھتے ہو
زندگی بھر جو سو نہیں پائے

*

پھر چلے ذکر کسی زخم کے چھل جانے کا
پھر کوئی درد کوئی خواب پرانا نکلے

احسان

شکر کر اے دلِ احسان فراموش کہ تو
در خورِ بخشش بے جا بھی رہا ہو کہ ہو

*

کوئی احسان چشم یار پہ نہیں
ہم اس کے ہیں مگر اس کو خبر نہیں

*

فرازؔ احساں ہے یاروں کا کہ یہ دل
گریباں بن گیا ہے چاک ہو کر

تھکن

گزر سکے تو گزر جا شبِ فراق کہ ہم
تھکے ہوئے بھی ہیں برسوں کا رتجگا بھی ہے

*

زندگی تیری امانت ہے مگر کیا کیجئے
لوگ یہ بوجھ بھی تھک ہار کے رکھ دیتے ہیں

فسانہ

فسانہ گو بھی کرے کیا کہ ہر کوئی سرِ بزم
مآلِ قصۂ دل دردناک چاہتا ہے

*

کہانیاں بھی انہیں سانحوں سے بنتی ہیں
جو رنج جھیل رہا ہوں ، فسانہ آگے تھا

*

جانتے ہیں وہ تنک خو ہے ، سو اپنا احوال
ہم سنا دیتے ہیں اَوروں کا فسانہ کر کے

گفتگو

یہ حرف و لفظ ہیں دنیا سے گفتگو کے لیے
کسی سے ہم سخنی کے مکالمے تھے الگ

گفتگو ایسی کہ بس دل میں اُترتی جائے
نہ تو پُر پیچ نہ تہہ دار نہ پہلو والی

ہوس

دانے کی ہوس لا نہ سکی دام میں مجھ کو
یہ میری خطا میرے شکاری نہیں بھولے

*

ہوس انعام سمجھتی ہے کرم کو تیرے
اور محبت ہے کہ احساں کو سزا جانتی ہے

*

وفا کا نام ہے ناکامیٔ محبت سے
وگرنہ کوئے ہوس تک یہ سلسلہ جاتا

قبا

چھپ چھپ کے کوئی چست کرے تنگ قبا کو
ہنس ہنس کے اُتارے کوئی زیور مرے آگے

*

چاکِ قبا پہ میری نظر تھی کہ یار نے
جلدی سے رکھ دیئے مری آنکھوں پہ آکے ہاتھ

بت

مَیں بت بنا اُسے دیکھا کیا تو اُس نے کہا
گزر چکی ہے بہت رات اب بجھا بھی دِیا

*

سودائے آذری میں ہوائے صنم گری
وہ بت پرستیوں میں عبادت کے رات دن

*

اے دل زدگاں ! موت ہے اظہارِ تمنا
وہ بت ہو خدا بھی تو خدا مت اُسے کہنا

ساقی

ساقی نے کتنے پیار سے دیکھا فرازؔ جب
مانگی شراب مَیں نے پیالہ بنا کے ہاتھ

*

ساقی شکستِ جام سے چہروں پہ دیکھنا
وہ رنگ بھی کہ شعلۂ مے سے نہ آئے تھے

*

ساقی یہ خموشی بھی تو کچھ غور طلب ہے
ساقی ترے میخوار بڑی دیر سے چپ ہیں

حوصلہ

مَیں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تُو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

*

مَیں اور تقابل غمِ دوراں کا حوصلہ
کچھ بن گیا سبب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

*

گرفتہ دل تھے ، مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں ، مگر حوصلہ بھی اب کے گئے

خدا

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں
ہم جسے چھو نہ سکیں اُس کو خدا کہتے ہیں

*

تُو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

*

تجھے تراش کے میں سخت منفعل ہوں کہ لوگ
تجھے صنم تو سمجھنے لگے خدا مجھ کو

ناخدا

ہر اک کو زعم تھا کس کس کو ناخدا کہتے
بھلا ہوا کہ سفینہ کنارے جا نہ لگا

*

وہ سفینے جنہیں طوفاں نہ ملے
ناخداؤں نے ڈبوئے ہوں گے

زنجیر

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخل زنداں جاناں

*

وطن سے دور بھی آزادیاں نصیب کسے
قدم کہیں بھی ہوں زنجیر گھر کی دیکھتے ہیں

*

وحشی کو ترے دشت نوردی نہیں بھولی
زنجیر بہ پا ہو کے بھی زنداں میں پھرے تھا

آنسو

یہ آنسوؤں کے ہار خوں بہا نہیں ہیں دوستو
کہ وہ تو جان دے کے قرضِ دوستاں چکا گیا

*

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس توقع پر کہ شاید تو پلٹ کر دیکھتا

*

کس دل آزار مسافت سے میں لوٹا ہوں کہ ہے
آنسوؤں میں بھی تپک پاؤں کے چھالوں جیسی

*

تیری نظروں میں مرے درد کی قیمت کیا تھی
میرے دامن نے تو آنسو کو گہر جانا ہے

غرور

غرورِ دوست سے اتنا بھی دل شکستہ نہ ہو
پھر اس کے سامنے دامانِ التجا لے جا

*

وہ گھمنڈ سے بچھڑا گلہ تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی تھی

*

شکست دے گیا اپنا غرور ہی اُس کو
وگرنہ اس کے مقابل بساط کیا تھی مری

*

غرور اس کا بھی کچھ تھا جدائیوں کا سبب
کچھ اپنے سر میں بھی شاید ہوا زیادہ تھی

سوال و جواب

مَیں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تغافل کب تک؟
مسکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے

*

ہم سے کیوں مانگے حسابِ جاں کوئی جب عمر بھر
کون ہیں، کیا ہیں، کہاں ہیں؟ ان سوالوں میں رہے

انتظار

نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سرِ منزل
وہ شخص جس کا ہمیں انتظار راہ میں ہے

*

تو پاس بھی ہو تو دل بے قرار اپنا ہے
کہ ہم کو تیرا نہیں انتظار اپنا ہے

وصل و فراق و ہجر

ہم کہ روٹھی ہوئی رت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسم ہجراں جاناں

*

کچھ اور دیر ابھی حسرتِ وصال میں رہ
کچھ اور دیر ابھی آتش فراق میں جل

*

ایسا لگتا ہے کہ ہر موسم ہجراں میں بہار
ہونٹ رکھ دیتی ہے شاخوں پہ تمہارے لے کر

*

فراق و وصل کیا ہیں عاشقی کے تجربے ہیں
مگر اس سے زیادہ زندگی کے تجربے ہیں

اُداسی

مجھ کو بھی تیری اداسی دلِ ویراں سی لگی
میں بھی اے شہر جدائی ترے قابل ٹھہرا

*

نہ جانے کیوں مری آنکھیں برسنے لگتی ہیں
جو سچ کہوں تو کچھ ایسا اداس ہوں بھی نہیں

*

اداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

دریا وقطرہ

مجبور تھے لے آئے کنارے پہ سفینہ
دریا جو ملے ہم کو وہ پایاب بہت تھے

*

اک درد کا پھیلا ہوا صحرا ہے کہ مَیں ہوں
اک موج میں آیا ہوا دریا ہے کہ تم ہو

ساحل

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اتر جائے گا

*

سفینے چھوڑ کے ساحل چلے تو ہیں لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں

سمندر

یہ کون ہے سرِ ساحل کہ ڈوبنے والے
سمندروں کی تہوں سے اچھل کے دیکھتے ہیں

*

مجھ سے کیا ڈوبنے والوں کا پتہ پوچھتے ہو
میں سمندر کا حوالہ نہ کنارے کی مثال

*

تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

طوفان

کیا حال کہوں قلزم ہستی کے سفر کا
تنکے کی طرح نوح کے طوفاں میں پھرے تھا

*

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اک بوند
دل میں اک لہر اٹھی آنکھ سے دریا برسا

کشتی

کشتیٔ جاں ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فرازؔ
اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر

*

پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
مَیں ڈوبتا ہوا دریا کے پار اتر بھی گیا

زمانہ

ابھی کچھ دیر پہلے تک یہیں تھے
زمانہ ہو گیا تم کو گئے کیا

*

وہ لاکھ زود فراموش ہو فرازؔ مگر
اسے بھی مجھ کو بھلانے میں اک زمانہ لگا

زندگی

ابھی ابھی تو جدائی کی شام آئی تھی
ہمیں عجیب لگا زندگی کا ڈھل جانا

زندگی اوڑھ کے بیٹھی تھی ردائے شب غم
تیرا غم ٹانک دیا ہم نے ستارے کی مثال

*

تمام عمر اگر زندگی نے زخم دیئے
تمام عمر کے زخموں کا اندمال تھی وہ

شام

آمدِ دوست کی نوید کوئے وفا میں عام تھی
مَیں نے بھی اک چراغ سا دل سرِ شام رکھ دیا

*

زندگی پھیلی ہوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

*

سامنے عمر پڑی ہے شب تنہائی کی
وہ مجھے چھوڑ گیا شام سے پہلے پہلے

شب

میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشم تر سے نکلا تھا

*

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

وقت

وقت رکتا ہی نہیں خواب ٹھہرتے ہی نہیں
پاؤں جمتے ہی نہیں بہتے ہوئے پانی پر

*

اس وقت نہ تھی آنکھ جھپکنے کی بھی فرصت
اک شہرِ طلسمات تھا یکسر مرے آگے

تنہا

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

*

تیرے ہوتے ہوئے آجاتی تھی ساری دنیا
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

*

اک محشرِ خیال کے ہجراں میں کاٹنا
تنہائی کے عذاب قیامت کے رات دن

چھاؤں

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے
پیڑ گرتا ہے تو آجاتے ہیں آرے لے کر

*

غریبِ شہر کسی سایۂ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سرو و سمن

*

غم کی لَو سے دھڑکتے دلوں کے کنول بجھ گئے
دھوپ میں کیسے کھلتے وہ چھاؤں کے پھول تھے

صنم

ہم موحد ہیں بتوں کے پوجنے والے نہیں
پر خدا لگتی کہیں تو وہ صنم اپنی جگہ

*

جیسے ہو مرے سامنے شدّاد کی جنت
جیسے ہو صنم خانۂ آذر مرے آگے

*

اس سنگ زار میں ہُنرِ آذری ہے شرط
کتنے صنم ہیں جو ابھی نا آفریدہ ہیں

دشمن

آج دشمن کی موت کا سن کر
یوں لگا میں بھی مر گیا کچھ کچھ

*

وہ مجھ سے پیار نہ کرتا تو وار کیا کرتا
کہ دشمنی میں بھی شدت اسی لگاؤ کی تھی

*

ستم گری کا ہر انداز محرمانہ لگا
مَیں کیا کروں مرا دشمن مجھے برا نہ لگا

جنگل

ہوا نہ دو کہ یہ جنگل کی آگ ہے یارو
عجب نہیں ہے اگر پھیل جائے شہروں میں

*

الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستا سا

*

دلوں سے وہ گزر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اُداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا

پتھر

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہوگئے

*

تو بھی ہیرے سے بن گیا پتھر
ہم بھی کل جانے کیا سے کیا ہو جائیں

*

روز کی مسافت سے چور ہوگئے دریا
پتھروں کے سینوں پر تھک کے سوگئے دریا

*

کافر

عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے والا
کوئی فرازؔ سا کافر نہیں تھا غازی تھا

*

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اسی کافر کے ہو گئے

صحرا

تیز سورج میں چلے آتے ہیں میری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا کا شجر جانا ہے

*

اس کی محفل نہ سہی ہجر کا صحرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح آؤ بکھر جائیں کہیں

*

میں کہ اک صبر کا صحرا نظر آتا ہوں تجھے
تو جو چاہے تو ترے واسطے دریا رو لوں

لہو

کبھی اس حسنِ دل آرا کی بھی تصویر بنا
جو تری سوچ کے خاکوں میں لہو بھرتا ہے

*

دستِ قاتل سے ہوں نادم کہ لہو کو میرے
عمر لگ جائے گی ہمرنگِ حنا ہونے تک

جس طرح ہر نوکِ خنجر پر لہو میرا نہ تھا
اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا

آگ

عجیب آگ ہے چاہت کی آگ بھی کہ فرازؔ
کہیں جلا نہیں کی اور کہیں بجھا نہیں کی

*

ابھی تلک تو نہ کندن ہوئے نہ راکھ ہوئے
ہم اپنی آگ میں ہر روز جل کے دیکھتے ہیں

*

کہیں تو آگ لگی ہے وجود کے اندر
کوئی تو دکھ ہے کہ چہرے دھواں ہمارے ہوئے

گھر

میں اپنے گھر کی طرح اس میں بس گیا تو کھلا
کرائے کے لیے خالی مکان تھی وہ بھی

*

بے طمع نوازش بھی نہیں سنگدلوں کی
شائد وہ مرے گھر بھی کسی کام سے اترے

مقتل

محفل میں کل فرازؔ ہی شاید تھا لب کشا
مقتل میں آج کاسۂ سر بھی اسی کا تھا

جو شرف ہم کو ملا کوچۂ جاناں سے فرازؔ
سوئے مقتل بھی گئے ہیں اسی پندار کے ساتھ

خنجر

دوست احباب تو رہ رہ کے گلے ملتے ہیں
کس نے خنجر مرے سینے میں اُتارا جانے

*

وہ صاحب دل ہوں کہ میری جان کا دشمن
تعظیم سے رکھ دیتا ہے خنجر مرے آگے

*

ایسا بھی تو رکھتے نہیں خنجر پہ گلو کو
اتنا بھی تو قاتل کو پشیماں نہیں کرتے

قاتل

مدت سے کوئی جانبِ مقتل نہیں آیا
قاتل بھی توقع سے پشیماں ہیں زیادہ

*

ایسے قاتل کو کوئی ہاتھ لگاتا ہے فرازؔ
شکر کر شکر کہ وہ دشمنِ جاں خواب میں تھا

*

میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے

پھول

گئی رتوں کا تعلق بھی جان لیوا تھا
بہت سے پھول نئے موسموں میں مرنے لگے

*

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

*

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

*

کھلے تو اب کے بھی گلشن میں پھول ہیں لیکن
نہ میرے زخم کی صورت نہ تیرے لب کی طرح

ستم

ہیں زخم بہت اور بھی دل پر مرے آگے
کوئی نہ کہے اس کو ستمگر مرے آگے

*

اس جفا جو کو دعا دو کہ اگر وہ نہ رہا
پھر کسی سے ستم ایجاد نہیں ہونے کے

*

ستم کے عہد میں چپ چاپ جی رہا ہوں فرازؔ
سو دوسروں کی طرح باضمیر میں بھی نہ تھا

فقیر

جس تاج کو دیکھو وہی کشکول نما ہے
اب کے تو فقیروں سے بھی سلطاں ہیں زیادہ

*

قاصد ! ہم فقیر لوگوں کا
اک ٹھکانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

یاد

وہ جن کو ہم تری قربت میں بھول بیٹھے تھے
وہ لوگ تیری جدائی کے بعد یاد آئے

*

ملول کر ہمیں، اتنا ملول کر جاناں
کہ ہم نہ یاد کریں تجھ کو بھول کر جاناں

*

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

چراغ

کون طاقوں پہ رہا کون سر راہ گزر
شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی ہے

*

میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

ہمیں تھے جو ترے آنے تلک جلے ورنہ
سبھی چراغ سرِ رہگذر نہ تھے ایسے

بارش

ورنہ اب تلک یوں تھا خواہشوں کی بارش میں
یا تو ٹوٹ کر رویا یا غزل سرائی کی

*

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

*

بہت سی خواہشیں سو بارشوں میں بھیگی ہیں
میں کس طرح سے کہوں عمر بھر اُسی کا رہا

ہجوم

اب پھر رہا ہُوں جسم کے ٹکڑے لیے ہوئے
شاید ہجوم چارہ گراں تھا مری طرف

*

ہجوم ایسا کہ مقتل میں جا نہیں ملتی
یہ جاں نثار سروں سے ٹلے نہ تھے ایسے

ہَوا

چراغ بجھتے ہی رہتے ہیں پر جو اب کے ہَوا
اِسے ہواؤں کا دیوانہ پن کہا جائے

اُدھر کی آگ اِدھر بھی پہنچ نہ جائے کہیں
ہَوا بھی تیز ہے جنگل قریبِ شہر بھی ہے

دھوپ

مَیں برف برف رُتوں میں چلا تو اُس نے کہا
پلٹ کے آنا تو کشتی میں دھوپ بھر لانا

*

کیسا موسم ہے کچھ نہیں کھلتا
بوندا باندی بھی دھوپ بھی ہے ابھی

*

تیری قربت بھی نہیں دکھ سے تہی
دھوپ کے پیوند ہیں چھاؤں کے بیچ

دل

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہے فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

*

سامنے تُو ہو تو سَو خواہشیں جاگ اُٹھتی ہیں
کاش اب کے مری آنکھوں میں میرا دل نہ رہے

*

اُس کے بدن کی آنچ مرے دل تک آگئی
آوارہ ہو رہے تھے مرے ہاتھ رقص میں

زوال

کیا اسی بھول کو کہتے ہیں محبت کا زوال
اب مجھے یاد نہیں سالگرہ بھی تیری

روشنی

حیران تھی کہ کتنے چراغوں کا خوں پیئے
آخر کو روشنی کے بھنور میں گھری ہوا

*

کچھ روشنی شہر کو ملی تو
جلتا ہے جلے مکان میرا

عہدِ وفا

تو ہے کس حال میں اے زود فراموش مرے
مجھ کو تو چھین لیا عہدِ وفا نے میرے

صبح

ہر کڑی رات کے بعد ایسی قیامت گذری
صبح کا ذکر بھی آئے تو لرز جاتے ہیں

اعتماد

وہ اعتماد کہاں سے فرازؔ لائیں گے
کسی کو چھوڑ کے وہ اب اگر ہمارے ہُوئے

*

بلا سے جاں کا زیاں ہو اس اعتماد کی خیر
وفا کرے نہ کرے پھر بھی یار اپنا ہے

باہیں

مری گردن میں باہیں ڈال دی ہیں
تم اپنے آپ سے اُکتا گئے کیا ؟

*

اپنی بانہوں میں سمٹ آئی ہے وہ قوسِ قزح
لوگ تصویر ہی کھینچا کیے انگڑائی کی

درخت

درخت ماؤں کے مانند انتظار میں ہیں
طیور لوٹ کے آئے نہ آشیانوں میں

*

اُجاڑ پیڑ گئے موسموں کو روتے ہیں
ہر آبجور کو ہوس پی گئی سمندر کی

*

کچھ درخت ایسے تھے فصلِ گل میں بھی جن پر
زرد زرد پتے تھے خشک خشک چھالیں تھیں

شوق

ہم ترے شوق میں یوں خود کو گنوا بیٹھے ہیں
جیسے بچے کسی تہوار میں گم ہو جائیں

راستہ

شہر دل میں تو سدا بھیڑ لگی رہتی ہے
پر ترے واسطے اے جانِ من آ، راستہ ہے

*

خود کو یوں محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں

*

مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
مَیں سنگِ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہوں

جگنو

درد ایسا ہے کہ بجھتا ہے چمک جاتا ہے
دل میں اک آگ سی ہے آگ بھی جگنو والی

*

جگنو کی روشنی سے بھی کیا کیا بھڑک اٹھی
اس شہر کی فضا کہ چراغ آشنا نہ تھی

خریدار

بکنے والوں میں جہاں ایک سے ایک آگے ہو
ایسے میلے میں خریدار کو کیا بولنا ہے

*

خود کو بیچیں تو کہاں ہم کہ دل و جاں کی جگہ
ہر خریدار کرے درہم و دینار کی بات

گلاب

بھری بہار میں اک شاخ پر کھلا ہے گلاب
کہ جیسے تُو نے ہتھیلی پہ گال رکھا ہے

*

یہ کہہ کے اُڑ گئے باغوں سے عندلیب تمام
جو باغباں تھے کبھی اب ہوئے گلاب فروش

*

یہ کیسی زہر بھری بارشیں ہوئیں اب کے
کہ میرے سارے گلابوں کا رنگ نیلا ہے

غزل

غزل میں جیسے ترے خد و خال بول اُٹھیں
کہ جس طرح تری تصویر بات کرنے لگے

*

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں جاناں

انسان

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

*

واعظو میں نے بھی انساں کی عبادت کی ہے
پر کوئی نقش نہیں ہے مری پیشانی پر

عالم

مدتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

*

ایسی مجبوری کے عالم میں کوئی
یاد آیا بھی تو کیا یاد آیا

شجر

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محرومی کی ہے
لوگ تو پھل پھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

*

سروِ جواں کی موت پر روئیں گی قُمریاں بہت
یوں تو بفیض باغباں قتل کئی شجر ہوئے

دیوار

دو گھڑی اس سے رہو دور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایۂ دیوار سے دیوار جدا

*

اب احتیاط کی دیوار کیا اُٹھاتے ہو
جو چور دل میں چھپا تھا وہ کام کر بھی گیا

ندامت

اب کے بچھڑ کے اُس کو ندامت تھی اِس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا

سکوت

سکوت میں بھی اس کے اک ادائے دل نواز تھی
وہ یارِ کم سخن کئی حکایتیں سنا گیا

آبلہ

پھر یوں ہوا کہ ساون آنکھوں میں آبسے تھے
پھر یوں ہوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

*

کسی کی آبلہ پائی عنایتِ رہِ دوست
کسی کی چاک قبائی نشانِ صحراء ہے

اجنبی

تیور تھے بے رخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

پَر

چاروں طرف ہیں دام شنیدن بچھے ہوئے
غفلت میں طائرانِ معانی کے پَر نہ کھول

تیر

مَیں نے کس نشۂ نخوت میں کماں کھینچی تھی
تیر جس جسم میں اُترا وہ بدن میرا تھا

*

مقامِ سودوزیاں آگیا ہے پھر جاناں
یہ زخم میرے سہی تیر تو اُٹھا لے جا

*

کہ جس کے ہاتھ میں پتھر کماں میں تیر نہ ہو
کوئی بھی ایسا مرے شہرِ مہرباں میں نہ تھا

نایاب

اس شہرِ محبت میں عجب کال پڑا ہے
ہم جیسے سبک لوگ بھی نایاب بہت تھے

داستان

تو ایک حرف و حکایت کے سلسلے کی طرح
طلسمِ ہوشربا کی داستان تھی وہ بھی

قیمت

فرازؔ اس سے وفا مانگتا ہے جاں کے عوض
جو سچ کہیں تو یہ قیمت ذرا زیادہ تھی

*

پاگل

مَیں جس کے ہجر میں رویا ہوں پاگلوں کی طرح
وہ کل ملا تو ہنسا میرے حال پر کیسا

*

عشاق کے مانند کئی اہلِ ہوس بھی
پاگل تو نظر آتے ہیں پاگل نہیں ہوتے

*

تم بھی پاگل ہو کہ اُس شخص پہ مرتے ہو فرازؔ
ایک دنیا کی نظر جس پہ جمی رہتی ہے

غزال

تجھ کو دیکھا تو لوگ حیراں ہیں
آگیا شہر میں غزال کہاں

دوست

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

*

دوست پرسش پہ مصر، اور ہمارا شیوہ!
اپنے احوال کو خود سے بھی چھپائے رکھنا

*****

کتابیات

سلسلہ نمبر مصنف کتاب کا نام مقام اشاعت سنہ اشاعت

۱۔ ابو الکلام قاسمی/ شاعری کی تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۲۔ حمد فراز/کلیات احمد فراز/ فرید بک ڈیولمٹیڈ، دہلی/ ۲۰۰۶ء

۳۔ ارشاد علی خان، پروفیسر رجدید اصول تنقید رکتابی دنیا، دہلی ر ۲۰۰۱ء

۴ رامتیاز بلوچ رحاصل مطالعہ (تنقید مضامین) ربیکن بکس گول باغ گلگشت کالونی، ملتان ر ۱۹۸۸ء

۵ رانیس اشفاق راردو غزل میں علامت نگاری راتر پردیش اردو اکادمی ر 1995ء

۶ ربشیر بدر، ڈاکٹر رآزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ رانجمن ترقی اردو، نئی دہلی ر ۱۹۸۱ء

۷ رحامدی کاشمیری، ڈاکٹر رامکانات (تنقیدی مقالات) رجے۔کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی ر ۱۹۸۷ء

۸ ررفعت اختر، ڈاکٹر رعلامت سے امیج تک رنازش بک سنٹر، دہلی رجولائی، ۱۹۹۵ء

۹ رسید حسین محمد جعفری، ڈاکٹر (اور) احمد سلیم ر پاکستانی معاشرہ اور ادب ر پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی راپریل، ۱۹۸۷ء

۱۰ رشمس الرحمن فاروقی رشعر، غیر شعر اور نثر رشب خون، کتاب گھر، ۳، ۳، رانی بنڈی راکتوبر، ۱۹۷۳ء

۱۱ رشمس الرحمن فاروقی راثبات ونفی رلبرٹی آرٹ پریس، دہلی رستمبر، ۱۹۸۶ء

۱۲ رشمیم حنفی رنئی شعری روایت رمکتبہ جامع نئی دہلی لمٹیڈ ر ۱۹۷۸ء

۱۳ رشمیم حنفی رغزل کا نیا منظر نامہ رمکتبہ الفاظ، مسلم یونیورسٹی مارکٹ، علی گڑھ ر ۱۹۸۱ء

۱۴ رعبادت بریلوی، ڈاکٹر رجدید شاعری رایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ر ۱۹۸۳ء

۱۵ رعبادت بریلوی، ڈاکٹر رغزل اور مطالعہ غزل رایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ر ۲۰۰۵ء

۱۶ رعلیم صبا نویدی رپاکستان میں اردو شاعری رتمل ناڈو، اردو پبلی کیشنز، چینائی ر ۲۰۰۸ء

۱۷ رعنوان چشتی، ڈاکٹر راردو شاعری میں جدیدیت کی روایت راردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی ر ۱۹۷۷ء

۱۸/ قاضی مشتاق احمد/ اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک/ مکتبہ جدید، دریا گنج، نئی دہلی/ ۲۰۰۲ء

۱۹/ قمر رئیس/ معاصر اردو غزل/ اردو اکادمی، دہلی/ ۱۹۹۶ء

۲۰/ کامل قریشی، ڈاکٹر/ اردو غزل/ اردو اکادمی، دہلی/ مارچ، ۱۹۸۷ء

۲۱/ گوپی چند نارنگ/ بیسوی صدی میں اردو ادب/ ساہتیہ اکادمی، دہلی/ ۲۰۰۲ء

۲۲/ محمد حسن، پروفیسر/ جدید اردو ادب/ جامع نئی دہلی لمٹیڈ/ ۱۹۷۴ء

۲۳/ معین الدین عقیل، ڈاکٹر/ پاکستان میں اردو غزل/ طارق منزل، برہا تو ہاؤزنگ رانچی/ ۱۹۸۱ء

۲۴/ ممتاز الحق، ڈاکٹر/ جدید غزل کا فنی، سیاسی و سماجی مطالعہ/ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی/ ۱۹۹۸ء

۲۵/ منظر اعظمی/ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ/ اتر پردیش اردو اکادمی/ ۲۰۰۴ء

۲۶/ منظر عباس نقوی، ڈاکٹر/ نثر، نظم اور شعر/ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ/ ۱۹۹۶ء

۲۷/ حمید اللہ شاہ ہاشمی، پروفیسر/ فن شعر و شاعری اور روحِ بلاغت/ اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی/ ۱۹۷۸ء

۲۸/ مرزا محمد عسکری/ آئینہ بلاغت/ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ/ ۲۰۰۶ء

۲۹/ مظفر شہ میری، ڈاکٹر/ اردو غزل کا استعاراتی نظام (از ابتدا تا غالب)/ معراج پبلیکیشنز، بالاجی کالونی، تروپتی/ ۱۹۸۴ء

۳۰/ عمر فاروق، ڈاکٹر/ اصطلاحاتِ نقد و ادب/ اردو اکادمی، دہلی/ ۱۹۹۴ء

رسائل

سلسلہ نمبر/ رسالہ/ شمارہ/ جلد/ مقام اشاعت/ ماہ و سال

۱/ ماہ نامہ اخبار اردو/ ۹/ ۲۵/ اسلام آباد (پاکستان)/ ستمبر، ۲۰۰۸ء

۲/ کتاب نما/ ۸/ ۴۹/ کتاب نما نئی دہلی/ اگست، ۲۰۰۹ء

۳/ ایوانِ اردو/ ایوانِ اردو، نئی دہلی/ جنوری، ۲۰۱۰ء

۴/ آج کل/ ۹/ ۵۴/ آج کل نئی دہلی/ اپریل، ۱۹۹۶ء

۵/ اردو دنیا/ دہلی/ جولائی، ۲۰۰۶ء

۶/ اردو دنیا/ دہلی/ نومبر، ۲۰۰۹ء

۷ رہمار دہلی ر دسمبر، ۲۰۰۸ء

۸ رہفت روزہ ہماری زبان (احمد فراز نمبر) رشمارہ ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۷ رجلد، ۶۷ رانجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی ر ۲۲ نومبر تا ۲۱ دسمبر، ۲۰۰۸ء

مقالات

سلسلہ نمبر رمصنف رمقالہ کا عنوان ر

۱ رعابدہ رخسانہ راستعارہ اور علامت (ایک نظریاتی مطالعہ) رغیر مطبوعہ رحیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی

۲ رمحمد جعفر راردو میں غزل مسلسل روایت اور فن رغیر مطبوعہ رحیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی

AHMAD FARAZ
KI SHAYERI KA TANQIDI JAYEZA
By : Dr. Aftab Arshi

نام : آفتاب احمد

قلمی نام : آفتاب عرشی

پیدائش : 9راگست 1986ء

والد کا نام : منیر احمد

مستقل پتہ : ہنسور، ضلع امبیڈکر نگر، اتر پردیش۔224143

تعلیم : ایم۔اے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی، لکھنؤ

بی۔ایڈ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدر آباد

ایم۔فل: حیدر آباد سنٹرل یونی ورسٹی، حیدر آباد،

پی۔ایچ۔ڈی: حیدر آباد سنٹرل یونی ورسٹی، حیدر آباد

موضوع: اردو شاعری کے فنی جہات (1960 کے بعد)

موبائل نمبر : 9347334855،9440936810

ای میل : arshi9886@gmail.com

مصنف کی دیگر کتابیں : 1۔ پیاسا دریا (شعری مجموعہ) 2۔ سوچ کی دہلیز (نظمیں اور دوہے)

3۔ پاگل دیوانہ (ترجمہ)

زیر طبع کتابیں : 1۔اردو شاعری میں جدید دوہا نگاری و انتخاب 2۔آوارہ نغمے (گیتوں کا مجموعہ)

3۔جذبوں کا دریا (شعری مجموعہ)
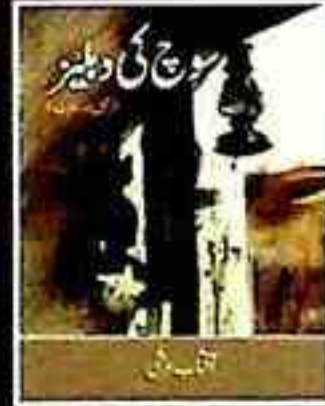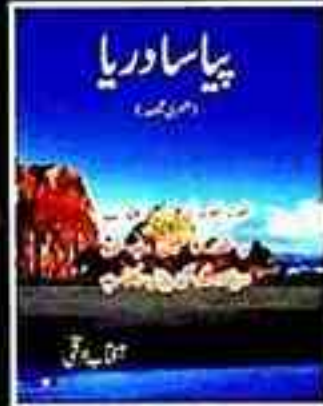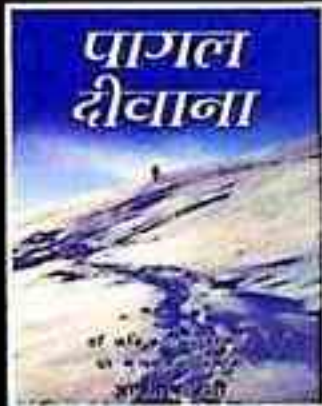
GNK PUBLICATIONS
Website : www.gnkpublications.com
Email : gnkpublications@gmail.com
Mob : 7006738304, 9541123110

ISBN 978-93-91606-00-8

₹ 325.00

 GNK Publications GNK URDU gnk.publications GnkPublications